

# اسلامی قانون میراث اور یتیم پوتے کی محرومی

( قانون شرعیہ کی ایک خالص فقہی بحث )

نعمت اللہ صدیقی

ادھر چند روز سے اسلامی قانون میراث کے ایک اہم مسئلے یعنی یتیم کے بیٹوں کی موجودگی میں یتیم پوتے کے حرمان کے بارے میں ایک دلچسپ بحث اٹھ کھڑی ہوئی ہے لیکن بجائے اس کے کہ یہ بحث سنجیدہ اور سائنٹفک طریق پر جاری ہوتی، یہ اخباری پروپیگنڈے کی گورنمنٹ کے چوکاں بن گئی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ پیش نظر مسئلہ کی فنی نوعیت کو، اور اس پر ہونے والی بحث کے محرکات کو پوری طرح سمجھ کر اسے سنجیدہ غور و فکر سے حل کیا جائے۔

## چند تمہیدی باتیں

بحث کی ابتداء | اس بحث کا مدوارہ اول اول مسلمانوں میں اس وقت کھلا ہے جب سے انگریزی حکومت کے تحت ہندو مانہ رواجی قانون وراثت نافذ ہوا۔ رواجی قانون سے جہاں مسلمانوں نے یہ اثر لیا کہ لڑکیوں کو بالکل محروم الارث کر کے رکھ دیا اور لڑکیوں کو شریعت کے دیے ہوئے حق وراثت سے محروم کرنے ہی کے لیے وراثت کے شرعی قانون پر مسلمان کھلم کھلا رواجی قانون کو ترجیح دیتے رہتے ہیں نیز قانون شریعت کے نفاذ کے بعد بھی لڑکیوں اور بہنوں سے دستبرداری کے بیانات دلوادلو کر ان کی حق ماری کتے ہے ہیں) وہاں ان میں یتیم کے زندہ بیٹوں کے حصص کے ساتھ اس کے مردہ بیٹوں کے حصص کو زندہ رکھ کر یتیم پوتوں کو وراثت قرار دینے کی تڑپ بھی پیدا ہو گئی۔ چنانچہ کسی کی بیوہ بہن، یتیم بھانجی یا نواسی،

اس بحث کے ایک بڑے محرک (SPONSOR) یعنی مولانا اسلم حیرا چوہدری نے بھی اسی حقیقت کی طرف

اشارہ کیا ہے کہ مشیما رلوگ جنہوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد بھی وراثت میں سابق خاندانی معمول کو بحال رکھا، ان کے لیے اسلامی قانون کو جذب کرنا الجھنوں کا موجب ہوا ہے۔

بلکہ خود یتیم پوتے کی ماں یعنی بیوہ بہو کے لیے کوئی بھت پیدا نہیں ہوتی۔ ساری توجہ یتیم پوتے کے ایک ہی مسئلے پر مرکوز ہے۔ اس سے پہلے پوری تاریخ اسلام و مسلمین میں اس بھت کے آثار نہیں ملتے۔

اس بھت کو باقاعدہ بھت بنانے کا کارنامہ منکرین حدیث کے مدرسہ فک نے انجام دیا ہے۔ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ چونکہ ملاؤں نے سازش کر کے قرآن کے ساتھ ایک وسیع من گھڑت سرمایہ روایات کو بھی حدیث نبوی اور سنت نبوی کے نام سے بہ حیثیت ماخذ قانون کے لاشامل کیا ہے اس وجہ سے ان کا فقہی نظام قانون الہی سے انحراف کر کے کچھ کا کچھ بن گیا ہے، اور اس کے ہر شعبے میں مضحکہ خیز اور لائیکل پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ اب ان مضحکہ خیز پیچیدگیوں کے بقا کی وجہ یہ ہے کہ سلف نے جو کچھ کہہ دیا، بعد کے لوگ بے سوچے سمجھے کھٹی پرکھی مارتے چلے آ رہے ہیں۔ چنانچہ اس مدرسہ فکر کے متوسلین نظام فقہ میں سے کرید کرید کر ایسے مسائل بھت برآمد کرتے رہتے ہیں جن کی اصولی بنیادوں اور جن کی فنی حیثیت کو تو عوام جانتے نہیں، اور نہ جن کے محل وقوع کو اسلامی نظام فکر و قانون کے مجموعی ڈھانچے (SET-UP) میں وہ متعین کر سکتے ہیں، اور پھر ان مسائل بھت سے پیدا ہونے والے اشکالات اور پیچیدگیوں کو۔ جو دنیا کے ہر قانونی نظام کی تفصیل میں کچھ نہ کچھ برہال ہوتی ہیں۔ نمک مرچ لگا کر اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ لوگوں میں انتشار نمودار ہو جائے۔ اس انتشار سے اشکالات اور پیچیدگیوں کو محل نظام فکر و قانون کے اندر رہ کر حل کرنا مطلوب نہیں، بلکہ اصل مطلوب حدیث اور سنت کے خلاف مہر کہ جاری رکھنا ہے۔ سوال یتیم پوتے کو میراث دلوانے کا نہیں، بلکہ سنت کے ترکہ نبوت سے امت کو محروم اللہ کرنے کا ہے۔

حدیث کو ملٹائی سازش قرار دے کر جس بھی مسئلے کی آٹھیں قدیم علمائے اسلام اور جدید مفکرین کتابت سنت کے خلاف محاذ بنایا جائے، ہر حال الحاد پسند (SECTARIST) عناصر کی بن آتی ہے۔ چنانچہ یتیم پوتے کی میراث کے مسئلے پر اخبارات میں ایسے بہت سے لوگ طبع آزمائی فرما رہے ہیں جو منکرین حدیث سے دو قدم آگے بڑھ کر سرے سے دین و مذہب کے وجود پر حملہ آور ہونا چاہتے ہیں۔ تیسری طرف ہمارے ایم، ایل، اے صاحبان ہیں کہ جو شریعت اسلامیہ کے نظام فکر و قانون پر ایمان

کھنے یا اُس کا ضروری علم حاصل کرنے کے لحاظ سے چاہے کسی بھی سطح پر ہوں، لیکن وہ اس کے بانٹنے اور  
بجائے کا اختیار ضرور رکھتے ہیں۔ اسمبلی کی کنیت اُن کو جو اختیارات دیتی ہے اُن کے استعمال کی جو  
ترتیب اب تک ہمارے ایم، ایل، اے حضرات کو ملی ہے وہ یہ ہے کہ کبھی کبھی وہ ذاتی اور خانہ داری مفاد  
ان خدمت کے ساتھ اپنی ساکھ بنانے کے لیے کچھ شاندار کارنامے بھی سر انجام دینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ عوام  
معموماً اپنے حلقے کے وٹروں کی خواہشات اور نفسیات کو سامنے رکھ کر ان کو خوش کرنے والا کوئی مسودہ  
قانون پیش کر دیتے ہیں۔ یہ مشق عام دنیاوی مباحثات کے دائرے میں تو جاری تھی ہی، اب خود اسلام  
پر شریعت سے بھی یہ دل لگی ہوئے لگی ہے۔

چنانچہ ترمیم ہونے کو چاہوں گے پہلے پہلہ وراثت دلوانے کے لیے جو خواہش ہمارے عوام بانٹنا  
زریعی آبادی کے حلقوں میں کار فرمایا ہے، اُسے اقبال چیمہ صاحب نے اچھی طرح بھانپ کر منکرین وراثت  
کے استدلال کو سامنے رکھتے ہوئے مسلمانوں کے شرعی قانون وراثت میں ترمیم کے لیے ایک مسودہ  
قانون پنجاب اسمبلی میں داخل کیا ہے۔ یہ ترمیمی مسودہ قانون اب چونکہ اسے عام معلوم کرنے کے لیے  
معلق چھوڑا گیا ہے، اس لیے منکرین وراثت، مخالفین دین عناصر، عام متعلقہ مفکر بلکہ خطوط نگار اخبارات  
میں اس مسئلہ پر طبع آزمائی کر رہے ہیں اور بحث بالکل عامیانا سطح پر آگری ہے۔

اگر آپ اس بحث میں حصہ لینے والوں کا تجزیہ کریں تو حسب ذیل عناصر سامنے آئیں گے۔  
ایک گروہ اس مسئلے کے موقف سے حدیث اور سنت کے خلاف معرکہ آرا ہے۔  
ایک گروہ اس بحث کے ذریعے "ملازم" کے خلاف جہاد میں مصروف ہے۔  
ایک گروہ اس جھگڑے کی آٹھیں مرے سے دین و مذہب ہی کے خلاف ایک فضا پیدا کرنے  
میں مصروف ہے۔

ایک عنصر محض زریعی آبادی کے وٹروں کو خوش کرنے کے درپے ہے۔  
ان عناصر کے علاوہ کچھ لوگ یقیناً ایسے بھی ہیں جو دیانت داری سے ترمیم پرتے کے مسئلے کو سمجھنا  
چاہتے ہیں، اور جو اشکال اس میں واقع ہو رہا ہے اس کا کوئی حل شریعت اسلامی کی رہنمائی ہی میں

پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

بحث کی دو صورتیں | ان سب عناصر کو سامنے رکھتے ہوئے ہم یہ گزارش کریں گے کہ بحث کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔

ایک صورت یہ ہے کہ آپ اسلام کو اپنا دین مانتے ہوں، قرآن اور سنت دونوں کو شریعت کے ماخذ کی حیثیت دیتے ہوں، اور پھر سوال یہ چھڑیں کہ ان ماخذ سے فقہ اور اتسباط اور اجتہاد کر کے جو قانون بنایا گیا ہے اس میں ایک یا چند مسائل میں ماہرین کی فکر نے کوتاہی کی ہے، یا اصولوں کو عملی تفصیل پر منطبق کرنے میں سہو ہو گیا ہے، لہذا اب از سر نو غور کر کے کسی اشکال یا پیچیدگی کو اسلامی نظام فقہ و قانون کے اندر رکھ کر حل کیا جائے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آپ سرے سے اسلام کو بہ حیثیت نظام زندگی کے مانتے ہی نہ ہوں یا اسے ایک یادگار کہن سمجھتے ہوں، یا صرف قرآن کو سند تسلیم کریں اور قرآن کی عملی تشریح کی حیثیت سے سنت نبوی کو ماخذ قانون مانتے ہی میں اصولی اختلاف رکھتے ہوں، اور اس رٹے کے نتیجے میں یہ سمجھتے ہوں کہ پورا نظام شریعت ہی غلط بن گیا ہے، یا آپ فقہ و قانون کو ملائی خرافات قرار دیں۔ اور اپنے ان نظریات کے لیے جنگ لڑنے میں تیم پونے کی میراث کے مسئلے کو محض آلہ اور ذریعہ بنا کر استعمال کریں، یا یہ کہ اسے محض بطور مثال یا دلیل سامنے لائیں۔

اگر صورتِ بحث دوسری ہو تو پھر ایک جزئی مسئلہ اگر آپ کے حسبِ منشا بھی حل کر لیا جائے، یا اس کے برعکس اس کی صحت و معقولیت خود آپ کی سمجھ میں بھی آجائے تو طبی اصل بنیادی جھگڑا جس کا میدان بڑا وسیع ہے جوں کا توں باقی رہتا ہے۔ ایک جزئی مسئلہ طے ہو جانے کے بعد وہ بنیادی جھگڑا پھر کسی اور جزئی مسئلے میں چھڑ جائے گا۔ لہذا بہتر یہ ہے کہ بنیادی اختلاف رکھنے والے حضرات اپنی ذاتی بنیادی بحث ہی کے میدان میں لڑیں۔ پھر اگر اختلاف رفع ہو جائے تو بہت خوب، ورنہ وہ جس دوسرے نظام فقہ و قانون کو چاہیں اختیار کریں، اور اسلام کو نظام زندگی مانتے اور قرآن کے ساتھ سنت کو ماخذ تسلیم کرنے والے مسلمانوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔

ہاں، اگر بحث کی صورت پہلی ہو کہ اسلام پر ایمان رکھنے اور قرآن و سنت کو بنیادی یا خد ماننے میں اور شریعت کے نظام فقہ و قانون پر مجموعی اعتقاد رکھنے میں اتفاق ہو اور سارا قضیہ یتیم بچے کی میراث تک محدود ہو تو پھر ہم اس بحث میں دلچسپی لینا ضروری سمجھتے ہیں۔ اور ہم منکرین حدیث اور محدثین کے حجاز سے قطع نظر کر کے اخلاص مند عنصر کو اصل مخاطب بنا رہے ہیں۔

ہمارا نظام فقہ و قانون اس مسئلے پر جو مناظرانہ اور اخباری بحثیں دیکھنے میں آ رہی ہیں ان کی سطحیت عابضاً کرتی ہے کہ سب سے پہلے اسلامی نظام فقہ و قانون کی مخصوص نوعیت کو واضح کر دیا جائے۔

یہ ایک الہی دینی نظام قانون ہے۔ اس کی بنیادیں خدا و رسول کی مقرر کردہ ہیں اور اس کے نشوونما کے لیے حدود لگا کر راستے مقرر کر دیئے گئے ہیں۔ یہ سبزہ بیگانہ کی طرح ہر طرف نہیں پھیل سکتا، بلکہ منضبط طریق پر ترقی کرتا ہے۔ اس کا میدان بالکل آزاد اور بے قید انسانی تفکر کے جولانیاں دکھانے کا میدان نہیں۔ اس میدان میں قدم دھرنے سے قبل انسانی فکر کو کچھ اصول و حدود کی پابندیاں قبول کرنی پڑتی ہیں، اور خدا و رسول کی دی ہوئی حکمت قانونی پر ایمان لانا پڑتا ہے، نیز اسلامی آخذ قانون کو ہی ترتیب سے قبول کرنا پڑتا ہے جو ترتیب شائع (LAW GIVER) نے مقرر کر دی ہے۔

یہ نظام قانون ایسا کھلونا بہر حال نہیں ہے کہ اس میں سطحی قسم کے انسانی جذبات بدھ سے چاہیں مداخلت کرتے رہیں۔ آج ایک جذبہ کی لہر اٹھی تو آپ نے کہا کہ اس میں فلاں تبدیلی ہونی چاہیے، کل ایک دو سزا جذبہ متحرک ہوا تو آپ تقاضا کرنے لگے کہ اس کا رخ ادھر سے ادھر کو بدل دیا جائے۔ جس کا جو خیالی پیدا ہوا اس نے اس کے حق میں پروٹیکٹڈ کیا، رائے عام کو اپنی حمایت میں لیا، ایک مسودہ قانون پیش کر دیا، تقریریں ہوئیں، رائے شماری عمل میں آئی اور میں ایک نیا ایکٹ بن گیا۔ اور پھر جو بھی نیا ایکٹ بن گیا وہ اسلامی قانون ٹھہرا۔ قانون کو کسی بھی معاشرے نے اس طرح موم کی ناک اور سطحی جذبات کا کھلونا نہیں بننے دیا ہے، کیا کہ اسلامی نظام فقہ و قانون!

اس نظام فقہ و قانون کے بارے میں دین کے مخالفوں اور منکرین حدیث وغیرہ نے یہ جو تصور پھیلا رکھا ہے کہ عقل سے کام نہ لینے والے چند مسیخ گمراہوں کے تیرتکے پرانی کتابوں میں لکھے چلے آ رہے ہیں

اور بعد کے لوگ لیکر کی فقیری میں مبتلا ہیں، اس تصور کے بارے میں کم سے کم سنجیدہ مزاج اور علمی ذوق رکھنے والوں کو جان لینا چاہیے کہ یہ بازاری قسم کی خرافات سے زائد کچھ نہیں۔ یہ نظام فقہ و قانون جسے آج آپ ایسی کتابوں کے اوراق میں دیکھتے ہیں جو ہماری تعلیم گاہوں کے نصاب سے خارج اور ہماری حدودِ مطالعہ سے باہر ہو گئی ہیں، یہ کچھ عرصہ قبل اسی طرح نافذ العمل تھا جس طرح آج اینگلو سکسن نظامِ قانون ہمارے ہاں رائج ہے۔ یہ باقاعدہ اسلامی ریاست کی مجالسِ شوریٰ (PARLIMENTS)

مجالسِ فقہا (LAWYER ASSEMBLIES) میں زیرِ بحث آ کر مدون ہوتا ہے، اور فاضل جموں اور

قانون دانوں نے اس کے اصولوں کو عدالتوں میں پیش آنند مقدمات پر منطبق کر کے ایک خاص وسعت تک پہنچایا ہے۔ یہ مسجدوں کے حجرہوں میں نہیں، بلکہ حکومت کے ایوانوں، یونیورسٹیوں، تحقیقی اداروں

(RESEARCH INSTITUTES) اور عدالتوں کے گہواروں میں ٹھیک اسی شان سے پلا ہے جس شان سے

آج کی کسی حکومت کا قانون پر و ان چڑھتا ہے۔ ایک ایک شعبہ میں اس کے اصول متعین کیے گئے

ہیں، حکمتیں اور مصلحتیں سامنے لائی گئی ہیں، فنی اصطلاحات وضع کی گئی ہیں، ایک خاص زبان اس

کے لیے نشوونما پائی ہے، اور خاص فنی مسائل اور قانونی پیچیدگیاں بالکل فطری طور پر ابھری ہیں جن

پر ماہرین نے وسیع سرمایہ فکر و نظر چھوڑا ہے۔ پھر واقعہ یہ نہیں ہے کہ مکھی پر مکھی ماری گئی ہے بلکہ

برعکس اس کے فقہا اور ماہرینِ قانون کے درمیان بڑی بڑی اختلافی بحثیں پائی جاتی ہیں، متفقہ اصولوں

پر جمع ہونے کے باوجود تفصیل میں آراء کا فرق نمایاں ہے، یہاں تک کہ چار بڑے بڑے مستقل

مدارسِ فکر ہماری فقہ میں پیدا ہو گئے ہیں اور پھر خود ان میں داخلی طور پر بھی اجتہادی اختلافات موجود ہیں

بعد میں یہ نظام فقہ و قانون سب نافذ العمل نہ رہا تو اس کا نشوونما اسی طرح رک گیا جس طرح

کوئی بھی دوسرا قانون عملی زندگی سے خارج کیے جانے پر نظری نشوونما سے محروم ہو جاتا ہے۔ لیکن

آج بھی اس کے سرچشموں کی روانی اس کے اصولوں کی مضبوطی اور اس کی صلاحیت نشوونما میں کوئی

فرق واقع نہیں ہوا۔ آج جو لوگ اسے روایاتی ڈھکوسلا اور ملاتی سازش کی پھبتیوں کا نشانہ بنا رہے

ہیں، وہ صرف اس بات کا ثبوت ہم پہنچاتے ہیں کہ انہوں نے اس نظام فقہ و قانون کا مطالعہ کیے

اس کی پابندی اور عظمت، اس کی معتقدیت اور اس کی وسعت و جامعیت کو نہیں جانا۔  
اس کے قانون کا بنیادی ڈھانچہ جن اجزا سے بنتا ہے وہ یہ ہیں۔  
(۱) نصوص، یعنی :-

۱۔ قرآن کے صریح احکام، ہدایات اور منہیات، مطلقیات اور ممنوعات

ب۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل سے مراد ثابت ہونے والے احکام و منہیات  
یہ وہ بنیادیں ہیں جن کو جوں کا توں پورے جذبہ تسلیم و رضا کے ساتھ قبول کر لینا اسلامی قانون کو  
معلوم کرنے، یا اس کی تعبیر کرنے، یا اس کے عملی حالات پر منطبق کرنے، یا اجتہادی دسٹے قائم کرنے  
ہی کے لیے نہیں، عین مسلم ہونے کے لیے شرط اول ہے۔ چنانچہ ہمارے نظام فقہ و قانون میں  
نصوص کے صریح اوامر و نواہی کو جوں کا توں قبول کر کے ساری اٹھان انہی کے اوپر اٹھائی گئی ہے۔  
(۲) اجماع، یعنی :-

نصوص کے صریح احکام کے اشارات اور دلائل سے جو اصول، مقاصد، مستزات، حکم و  
مصالح، لازمی نتائج کے طور پر سامنے آنے والے اہم قانونی نکات اور اجتہادات و استنباط کے کلیات  
افتد ہوں، ان میں سے جس جس چیز کے ایک مرتبہ اسلامی شریعت اور اسلامی عدالتوں کے اختیار  
کر لینے کے بعد کامل انفاق سے مستقلاً قبول کر لیا گیا ہو اور بعد کے ارباب حل و عقد مجالس شریعی  
اور اسلامی عدلیہ (JUDICIARY) کے اداروں، نیز ماہرین قانونیات (JURISTS) نے  
جس کی پاسداری کی ہو، وہ اجماعی اصول یا فارمولابن جاتی ہے۔ چنانچہ ہمارے ہر قانون کچھ کلیات

سے واضح ہے کہ اجماع سے نہیں کہتے کہ چند مولوی یا مفتی کسی فتوے پر مل کر دستخط کریں۔ بلکہ اصلاً اجماع کی  
اصطلاح ایک سیاسی اور قانونی اصطلاح ہے۔ بعد میں اس کا ایک ضمنی استعمال یہ بھی رائج ہوا ہے کہ علمی دسٹے میں  
تمام ماہرین و مفکرین اپنے اختلاف کو حل منفقہ اصول و کلیات سے محدود دیکھتے ہیں ان کے لیے اجماع کی اصطلاح  
برتی جاتی ہے۔ "اجماع" ہر نظام قانون کا ایک اہم عامل ہے۔ اس کی حقیقت کو سمجھنے میں ایک تازہ ترین مثال  
بڑی مدد دے سکتی ہے۔ پنجاب ہائی کورٹ نے مولانا عبدالستار خاں نیازی کی اپیل کو خارج کرتے ہوئے رائے دی ہے



اور فارمولوں پر قائم ہوتا ہے اور اس کے اندر واقع ہونے والے اختلافات کو یہ کلیات اور فارمولے ایسی حدود میں محدود رکھنے کا پارٹ ادا کرتے ہیں جن کے ذریعے اس نظام قانون میں استقلال (STABILITY) پیدا ہوتا ہے۔ ورنہ اگر مجالس شوریٰ یا اسمبلیاں اپنے ہر اجلاس میں، اور عدالتیں اپنی ہر کارروائی میں بار بار کلیات اور فارمولوں کو توڑتی رہیں اور نئے نئے کلیات اور فارمولے وضع کرتی رہیں تو قانون کا کوئی مستقل ڈھانچہ بن ہی نہیں پاتا پھر وہ ریت کا ایک گھر وندابن کے رہ جاتا ہے۔

کلیات اور فارمولوں کو جب ایک مرتبہ اختیار کیا جاتا ہے تو پھر وہ قانون کے پورے نظام پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ان کو کوئی بھی حصے قائم کرنے، فیصلہ دینے، اجتہاد کرنے یا کسی مقدمے میں کوئی تغیر قائم کرنے کے عمل میں پوری طرح پیش نظر رکھا جاتا ہے پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ کلیات اور فارمولے کہیں نہ کہیں تفصیل میں جا کر جب باہم و گرفتار ہوتے ہیں تو کچھ نہ کچھ پیچیدگیاں ہر کلیے اور ہر فارمولے کو پیش آتی ہیں لیکن دنیا کے کسی بھی نظام میں یہ حماقت نہیں کی جاتی کہ جہاں کسی کلیتے یا فارمولے کی وجہ سے کوئی پیچیدگی سامنے آتی تو اسے چھوڑ کر تھپٹ ایک نیا متضاد کلیہ یا فارمولہ گھڑ لیا۔ بلکہ کلیات اور فارمولوں کے بنیادی ڈھانچے کو برقرار رکھ کر اسی کے اندر رہتے ہوئے پیچیدگیوں کا حل تلاش کیا جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح اجماع کا انسٹی ٹیوشن اسلامی نظام قانون کو ایک مستقل ڈھانچہ فراہم کرنے کے لیے نصوص ہی سے اخذ کردہ متفق علیہ کلیات اور فارمولے سامنے لاتا ہے۔ ان کلیات اور فارمولوں کے باہمی تعامل سے تفصیل میں کہیں نہ کہیں پیچیدگیاں بھی نمودار ہوتی ہیں لیکن ان پیچیدگیوں

(بقیہ ص) لاہور کے مارشل لاء کے باہر میں جو ریڈ کرس ٹیٹے تھے ان کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ مارشل لاء عام عدالتوں کے منواری اپنی عدالتیں ٹھیک کرانسیڈری سٹرائٹس کے ساتھ تعزیری سٹرائٹس نافذ کرنے اور قیام امن کے لیے ضرورت کی حد سے آگے جا کر مختلف کارروائیاں کرنے کی وجہ سے ایٹو سیکس سٹیم آف لاء کے لیے بالکل اہم ہے یعنی ایٹو سٹیم آف لاء جن کلیات اور فارمولوں پر قائم ہے اور جن کے خلاف نہ کسی پارلیمنٹ نے کبھی کوئی قانون سازی کی ہے نہ عدالتوں نے کبھی فیصلہ دیا ہے کہ کوئی نئی تغیر قائم کی ہے، — یا دوسرے لفظوں میں ایٹو سیکس سٹیم آف لاء کا جن چیزوں پر اجماع ہے — یہ مارشل لاء ان کے مطابق نہیں ہے اس مثال سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ "اجماع" ہر نظام قانون کا ایک اہم اصول ہوتا ہے۔



کی وجہ سے نہ اس قانون کو ملانی ڈھکوسلا اور سازش کی پھبتیوں کا نشانہ بنانا کوئی معقول حرکت ہو سکتی ہے اور نہ ان جزئی چیزوں کی خاطر قانون کے مجموعی ڈھانچے کو توڑ پھوڑ کر نیت نیا ڈھانچہ بنانے میں لگ جانا اجتہاد کے حق کو استعمال کرنے کی کوئی صحیح صورت ہے۔ ان جزئی پیچیدگیوں کو بہر حال اسلامی نظام فقہ و قانون کے مجموعی فریم میں رکھ کر اجماعی کلیات اور فارمولوں کے تحت ہی حل کیا جاسکتا ہے۔

اب اگر کچھ لوگ سرے سے اجماع کے انسٹی ٹیوشن ہی کو نہ مانیں، یا جن کے نزدیک سنت رسولؐ ماخذ قانون ہی نہ ہو، ان کے لیے تو ہمارے نظام فقہ و قانون سے دلچسپی کی کوئی وجہ ہی نہیں اور نہ ان سے بحث کی کوئی بنیاد باقی رہ جاتی ہے۔ ان کو حق پہنچتا ہے کہ وہ نئے کلیات اور فارمولے بنا کر پورا ڈھانچہ ہی از سر نو مرتب کریں۔ لیکن جو لوگ سنت رسولؐ کو نص ہی کا درجہ بھی دیں، اجماع کے انسٹی ٹیوشن کو بھی واجب الاحترام سمجھیں، نیز قانون کے مجموعی ڈھانچے کو برقرار رکھتے ہوئے کسی مسئلے کو حل کرنا چاہیں ان کے لیے لازم ٹھہرتا ہے کہ وہ :-

ا۔ کسی معاملے پر بحث چھیڑیں تو نصوص اور ان کے اشاراتی اور دلالاتی تقاضوں کو جانیں،  
ب۔ جو کلیات اور فارمولے اجماع کا درجہ رکھتے ہوں ان کے دور رس اثرات کا ہمہ پدا کریں اور ان کی حدود میں رہ کر سوچ بچار کریں،

ج۔ کسی بھی شعبے سے تعلق رکھنے والے قانون کے مجموعی ڈھانچے کی ترتیب کو سمجھیں،

د۔ اور اگر خود قانون کی فنی بحثوں کے لیے تفصیلی علم نہ رکھتے ہوں تو یا تو علم حاصل کرنے پر متوجہ ہوں، یا پھر واقعی علم رکھنے والوں سے استفادہ کریں۔

یہ معاملات بہر حال سطحی تبدیلیاں نہیں ہیں اور عام سیانہ اخباری پڑھنے کے کاغذات متنبہ کرنے کے لیے موزوں نہیں ہیں۔

## اصل مسئلہ فقہ اسلامی کے فریم میں

ہمارا قانون میراث کسی بھی نظام قانون میں اگر آپ کیڑے نکالنے پر تامل جائیں تو یہ کوئی مشکل کام نہیں۔

تفصیلات کے میدان میں بہت سی چیزوں کو آپ نامعقول کہہ سکتے ہیں، بہت سے احکام اور فیصلوں کا مذاق اڑا سکتے ہیں، اور ایسی چند چیزوں کے ہاتھ لگ جانے پر، آپ کو اس سے بھی کوئی نہیں روک سکتا

کہ اُس نظام قانون کے سائے دفتر علم و تحقیق کو بے معنی قرار دے کر پر سے چھینک دیں۔ لیکن اگر آپ سنجیدگی اور انصاف سے کام لے کر دیکھیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ قرآن کی چند آیات اور رسول اللہ صلعم کی چند احادیث کو بنیادی سرچشمہ ہدایت مان کر، اُن سے احکام، اصول اور بنیادی مصلحتیں اخذ کرنے میں اسلامی قانون میراث کے مرتب کرنے والوں نے بہت بڑا کام انجام دیا ہے۔ رشتوں اور تعلقات میں سے ایک ایک کی درجہ بندی کر کے اُن کی صغیف بنیادی ہیں، تمام ممکن وراثی فہرست اور یتیم (SENIORITY) اور اخرویت (JUNORITY) کے لحاظ سے پورے استدلال کے ساتھ مرتب کر دی ہے، اصطلاحات مقرر کی ہیں، میراث کی خاص ریاضی تدوین کر دی ہے، چنانچہ ہمارے باہرین قانون نے ایک اسی قانون کے دائرے میں اتنا وسیع تر پھر چھوڑا ہے اور مطالعہ و تحقیق کے لیے اتنا مواد بعد والوں کو بہم پہنچا دیا ہے کہ اس پر صرف اسپیشلائز کرنے والے علمائے حادی ہو سکتے ہیں۔ ہمارا قانون میراث صحیح معنوں میں ایک سائنس ہے جو ٹھیک سائنٹفک انداز سے پروان چڑھی ہے۔ اس سائنس کا جب بھی مطالعہ کیا جائے، یا اس کے مسائل میں جب بھی اظہار رائے کیا جائے تو سنجیدہ اور سائنٹفک انداز (APPROACH) اختیار کرنا چاہیے۔

ہمارے قانون میراث کے چندا جماعی فارمے اور کلیات جس طرح ہم نے اوپر تفصیل سے بیان کیا تھا، ہمارے قانون میراث کا ڈھانچہ بنانے میں چند فارمولوں اور کلیات کو استعمال کیا گیا ہے۔ ان فارمولوں اور کلیات پر ان اول تا آخر مجالس شرعی اور عدالتوں اور علمائے قانون کا اتفاق رہا ہے اور ان کو ہمیشہ ہمارے نظام فقہ و قانون میں ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اسی وجہ سے ہم کہیں گے کہ ان پر اجماع ہے۔ یہاں ہم بحث سے تعلق رکھنے والے چند کلیات کو پیش کرتے ہیں:-

پہلا کلیہ | سیدہ نسائے مکہ کے رکوع اول میں "ما ترک الوالدان والاقربون" کا دو بار آیا ہوا ٹکڑا، نیز دوسری تمام متعلقہ آیات میں قرابت کے رشتوں کا بنا پر حق وراثت کا تعین صاف بتاتا ہے کہ یہ حق جس بنیاد پر قائم ہوتا ہے وہ قرابت ہے۔

دوسرا کلیہ | قرابت کو میراث پانے کے حق کی بنیاد مانتے ہی یہ سوال سامنے آجاتا ہے کہ آیا ایک میت

کے ترکہ میں سے اس کے تمام کے تمام قرابت دار بیک دم حصہ پائیں گے یا بعض کے ہوتے ہوئے بعض محروم رہیں گے، نیز کیا سب کا حصہ مساویانہ ہوگا، صریح نصوص شرعیہ کے ان دونوں امور کا جواب نفی میں دینی ہے۔ نصوص ہی کی رہنمائی سے ہمارے ماہرین قانون و JURISTS نے سب ذیل دو باتیں علم میراث کے اساسیات (FUNDAMENTALS) کے طور پر طے کر کے ان پر اجماع کر لیا ہے کہ:-

۱۔ کسی میت کے تمام کے تمام اقربا یا ممکن وراثت دار بیک دم میراث نہیں پاسکتے، بلکہ وہ قرابت میں جو مقدم ہیں، وہ تو فریق کو کھلا یا جزو محروم کرتے ہیں یعنی بس متعین حصے یا کل ترکہ کو بانٹنے کے لیے زیادہ قریبی وارث موجود ہوں گے، وہ دور والوں تک نہیں پہنچتے گا۔

۲۔ کسی میت کے قانوناً وارث قرار پانے والے اقربا اگر وہ قرابت کے لحاظ سے یکساں نہ ہوں تو ان کا حصہ مساویانہ نہیں ہو سکتا بلکہ تعلق کے قریب و بعد کے لحاظ سے کم و بیش ہوگا۔

قرابت کے فرق مراتب کو سب سے پہلے سورہ نسا کی آیت مذکورہ بالا کا لفظ "ما تروک الوالدان والاقربون" واضح کرنا ہے۔ ان الفاظ کے ذریعے شامع نے رہنمائی دے دی کہ قرابت داری کے دو سہ تمام مدارج پر حجت یعنی اپنے والدین سے وراثت پانے کا حق قائم کرنے والے تعلق کو قرابت حاصل ہے اسی لیے اقربا کی عام صف میں سے والدین کو الگ کر کے اہلین مرتبہ دیا گیا ہے پھر واولاد

الانعام بعضہم اولیٰ بعضہ فی کتاب اللہ" میں صراحت کر دی گئی کہ تعلقات ریحی کے مدارج مختلف ہیں۔ اسی حقیقت سے "الاقرب فالاقرب" کا اصول ماخوذ ہے۔ اور اس اصول پر عقلی اجماع ہے۔ مدارج قرابت [قرابت کے لیے فرق مراتب کو تسلیم کر لینے کے بعد لازم ٹھہرا کہ قانون میں اس فرق کو تفصیل

سے واضح کیا جائے۔ چنانچہ ماہرین نے خود نصوص ہی سے روشنی حاصل کر کے بڑے سائنٹفک طریق سے اقربا کے مدارج مقرر کیے ہیں۔ بنیادی علم پر ان کو فریق سطحوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلی صف وارث بننے والے ان اقربا کی ہے جن کو ذوی الفروض کہتے ہیں۔ یہ وہ اقربا ہیں جن کے حصے قرآن میں متعین طور پر بیان کر دیئے گئے ہیں۔ قاعدہ یہ ہے کہ سب سے پہلے ان لوگوں کے متعین حصے الگ کر دیئے جاتے ہیں، بقیہ حقوق یا حساب بعد میں ہوتا ہے۔

دوسری صف وارث بننے والے اُن اقربا کی ہے جن کو عصبات (RESIDUARIES) کہتے ہیں۔ یہ لوگ یا تو ذوی الفروض کے متعین حصے ادا ہونے کے بعد تبقیہ ترکہ جیتتے ہیں، یا اُن کی عدم موجودگی میں ترکہ پاتے ہیں۔

عصوبت کے حق کے لیے استدلال کا سرچشمہ ذیل کی نصوص میں :-

(۱) سورہ نساء کے رکوع ۲ کی آیت یوسیکھا اللہ فی اولادکم..... الخ میں یہ ٹکڑا کہ "فان لکم" لیکن لہ ولد وورثہ ابواک ولائہما اللہ" باپ کو جس بنیاد پر وارث بنا تا ہے اسی کے لیے عصوبت کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ بخلاف اس کے میت کی ماں صاحبہ فرض ہوئی، کیونکہ اس کے لیے ہا متعین کر دیا۔

(۲) ابن عباسؓ کی روایت "الحقوا الفرائض باهلها فسا بقی فهو لاولی رجل ذکیر" میں قریب ترین درجہ قرابت کے مرد کو جو استحقاق خصوصی دیا گیا ہے وہ عصوبت کا استحقاق ہے یعنی ذوی الفروض کے متعین حصے ادا کرنے کے بعد عصبہ کو وارث ملے گی۔

(۳) حضرت عمرؓ کی روایت کہ آپ نے نبی صلعم کا یہ ارشاد سنا کہ "ما احوز الوالد والولد فهو لعصبته من کان" (یعنی جو کچھ مال باپ یا بیٹے کا جمع کردہ ہو تو وہ اس کے عصبہ کا ہے، جو بھی ہوں) عصبیت کی ایک مستقل حیثیت متعین کرتی ہے۔

(۴) روایت بخاری "واجعلوا الاخوات مع البنات عصبۃ" (یعنی جب محض لڑکیاں وارث ہوں، لڑکا کئی نہ ہو تو بہنوں کو ان کے ساتھ عصبہ قرار دو) بھی مرتبہ عصوبت کے لیے ایک واضح دلیل اور سند ہے۔

تیسری صف وارث بننے والے اُن اقربا کی ہے جن کو اولوالارحام (DISTANT KINDREDS) کہتے ہیں۔ یہ وہ رشتہ دار ہیں جو نہ تو ذوی الفروض میں ہوں، نہ عصبیت کے مقام پر بلکہ جن کا تعلق قرابت کسی عورت کے واسطے سے میت کے ساتھ قائم ہوتا ہو۔ یہ ذوی الفروض اور عصبیت کی دونوں صفوں کی عدم موجودگی میں ترکہ پاتے ہیں۔ ان کا استحقاق ذیل کی نصوص سے ثابت ہے :-

(۱) "للرجال نصیب مما ترک الوالدان والاقرابون وللنساء نصیب"..... الخ

ترجمہ۔ مردوں کا حصہ ہے اس مال میں جو باقی چھوڑیں ان کے والدین اور اقرباء اور عورتوں کا حصہ ہے اس مال میں جو باقی چھوڑیں ان کے والدین اور اقرباء میں یہ حقیقت کہ لفظ "اقربوں" قرابت کے سلسلے مراتب پر حاوی ہے، نیز "للفسار" کی یہ توضیح کہ عورتیں بھی سلسلہ قرابت میں داخل ہیں، اولوالارحام کی صف کو ایک مقام دیتی ہے۔

(۲) سورہ انفال کی آیت "اولوالارحام بعضہم اقرب بعض" (ترجمہ نہ قرابت رحمی کہنے والے رشتہ دار خدا کے قانون کے تحت ایک دوسرے پر قربت رکھتے ہیں) کے الفاظ فرید صراحت کر رہے ہیں۔

(۳) نبی صلعم کا یہ ارشاد کہ "الحال وارث من الارث لہ"۔ بخاری دہمویں اس کا وارث ہے جن کا کٹل اور وارث نہ ہو، قطعی طور پر حلال ہے کہ ذوی الفروض اور عصباء کی عدم موجودگی میں اولوالارحام حسب مراتب وارث ہونگے۔

تقسیم در تقسیم | چونکہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی وارث ایک طرف سے ذوی الفروض میں داخل ہے دوسری طرف سے عصباء میں، اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا مقام بہ یک وقت عصباء میں بھی ہو اور اولوالارحام میں بھی، نیز چونکہ خود ذوی الفروض، عصباء اور اولوالارحام کی مفعول میں داخل طور پر تقدم و تاخر پایا جا سکتا ہے، اس لیے تین صنفوں کو پھر تین درجہ (GRADES) میں تقسیم کر کے کل ہر گروپ بنا دیئے گئے ہیں۔ تفصیل یہ ہے :-

طبقات	انصاف وراثت	ذوی الفروض	عصباء	اولوالارحام
طبقتہ اول (یعنی میراث کے ذریعہ)	خاوند۔ بیوی۔ بیٹی۔ پوتی غیر	بیٹا۔ پوتا۔ پوتہ اور غیر	بیٹی کی اولاد۔ پوتی کی اولاد وغیرہ	
طبقتہ دوم (یعنی میراث کے اصول)	ماں۔ باپ۔ دادا۔ دایہ۔ نانی وغیرہ	باپ۔ دادا۔ پردادا وغیرہ	نانا۔ نانی کا باپ۔ نانا کا باپ وغیرہ	
طبقتہ سوم (یعنی میراث کے اصول)	بہن۔ جھتی۔ بہن عیال۔ بہن عیال کی عیال	بھائی۔ جھتی۔ بھائی عیال۔ بھائی عیال کی عیال	بھائی۔ بہنوں کی اولاد اور بھائی عیال کی اولاد وغیرہ	

پھر ان طبقات اور صنفوں کے ہر گروپ کے اندر ایک ایک رشتہ دار کے تقدم و تاخر کو متعین کیا گیا ہے

اور اس تحقیقی کام کی تکمیل کے لیے نصوص کے ان اشارات سے بھی مدد لی گئی ہے جو نکاح و طلاق، وصیت و ولایت، وکالت وغیرہ کے سلسلے میں، رسول کی وجہ بندی کرنے میں کچھ بھی مدد دیتے ہیں۔

ان گروہوں میں سے اگر گھر سے کوئی رشتہ دار موجود نہ ہو تو پھر چند شاذ صورتیں غیر شہ داروں کو ان کے وراثہ پانے کی ہیں، وہ بھی نہ ہوں تو آخری صورت میں پوری مسلم سوسائٹی (اسلامی بیت المال) وارث ہے۔ یہ تفصیل اس لیے دی گئی ہے کہ حقیقت سمجھی جاسکے کہ قانون میراث ایک وسیع مرتبہ ٹھکانے والا رکھتا ہے، اور کوئی نئی چیز اس صورت میں اختیار کی جاسکتی ہے جبکہ وہ اس ڈھانچے میں اپنی جگہ بنا سکتی ہو۔ وہ چیزیں جو ضروری تبدیلی کے بجائے پرے ڈھانچے کو توڑ کر داخل کی جاسکتی ہوں، ان کے لیے اس ڈھانچے میں جگہ نہیں ہے۔

**تیسرا اکتیس** | اوپر کی تقسیم مراتب کتاب و سنت کے جن ضریح احکام یا اشارات و دلالات پر مبنی ہے ان کی سوسے لازم آتا ہے کہ اگر ایک ہی طبقہ، ایک ہی صف یا ایک ہی گروہ کے چند ایسے ممکن وارث موجود ہوں جن میں سے کچھ مقدم ہوں، کچھ موخر، تو مقدمات سارا ترک دیا اس کا وہ خاص حصہ جس کا معاملہ زیر غور ہونے لگے جائیں گے اور موخرین وارث نہیں ہوں گے۔ اس اصول کو "الاقرب فالاقرب" (پہلے قریب کے، پھر دور کے) کہہ لیا جائے۔ اور اس پر قطعی اجماع ہے۔

اس اصول کے تحت قاعدہ یہ ہے کہ جس شخص کا رشتہ میت سے کسی دوسرے شخص کے واسطے سے ہو تو جس متوسط مقدم ہو گا اور متذکرہ شخص کو موخر کر دے گا۔ چنانچہ یہی حکم ہے جو آگے چل کر کلیۃً "حب" (یعنی کسی ممکن وارث کے ترک پانے میں اس سے قریب درجے کے وارث کا جزو یا کلاً حائل ہو جانا) کی بنیاد بنا ہے۔

**چوتھا کلیہ** | چونکہ ابن عباسؓ کی روایت "النفوا للنفوس باہلھا فالاقرب فہو الاقرب رجلی ذکر" (یعنی سب سے پہلے نصوص کے مفرد کو دیکھئے، ان کے مقداروں کو ان کو دیکھو، پھر جو باقی بچے وہ سب سے زیادہ قریبی مرد کا حق ہے) درجہ اول کے قریب ترین مرد کو مرتبہ وصیت دیتی ہے، لہذا کلیۃً یہ ہے کہ جب کوئی مرد وصیت کا مرتبہ پانے سے تمنا کی ہو تو اس مرتبے میں اس کی شریک بنتی ہے، (باقی صفحہ ۳۱۷)

ہمک درجہ اول کا کوئی فرد بھی عصوبت کا مقام لینے کو موجود ہو، اس مقام کو اس سے بعد کے درجے کا کوئی وارث نہیں لے سکتا۔ مرتبہ عصوبت میں بلا واسطہ اقربا اور بالواسطہ اقربا کبھی جمع نہیں ہو سکتے۔ نہ صرف یہ کہ اس معاملے میں حدیث بالکل قطعی اور متفق علیہ ہے، بلکہ قرآن کی آیات میں بھی اس کے خلاف دلیل بننے والی کوئی جزئی سے جزئی صورت اخذ نہیں کی جاسکتی۔ پس یہ کلیہ ایسے کلیوں میں سے ہے جن کا ترک خود شریعت اسلامیہ کو، قرآن و سنت کو الوداع کہنے کے ہم معنی ہے۔ واضح رہے کہ یہ کلیہ جو اوپر کے کلیوں کا فطری تقاضا بھی ہے چچاؤں کی زندگی میں میم پوتوں کے وارث ہونے میں منع ہے۔

پانچواں کلیہ | پانچواں کلیہ جو برائے نصوص صدنی صد قطعی ہے، یہ ہے کہ کوئی شخص کسی شخص کی زندگی میں اس کا وارث نہیں ہو سکتا۔ وارث کوئی بتنا ہی اس وقت ہے جب کوئی شخص موت کی مرحلہ سے گذر جائے اور مال چھوڑے۔

نصوص قرآنی میں جہاں قانون وراثت بیان ہوتا ہے وہاں ہر ہر ٹکڑے میں مما ترک، ماتوک، ماتوکون، مما ترکتم، کے الفاظ بار بار وارد ہیں۔ یعنی قانون وراثت کی بحث کا موضوع ہی ترکہ ہے۔ نہ کوئی مال کسی شخص کی زندگی میں ترکہ ہو سکتا ہے، نہ اس مال میں یہ حیثیت وارث کسی کا حق پیدا ہوتا ہے۔

پھر ملاحظہ ہو سورہ نساء رکوع ۲۴ کی آیت یسئفتونک . . . الخ میں آتا ہے ان اضرأ  
 هذک لیس لہ ولد ولہ اخت . . . (اگر کوئی شخص مر گیا، اور اس کی کوئی اولاد نہیں ہے بلکہ  
 اس کی بہن موجود ہے تو . . .) یہاں پوری وضاحت ہے اس بات کی کہ وراثت تلاش کرنے کا  
 سوال، یا اقربا کے استحقاق وراثت کا سوال کسی شخص کے مرنے پر پیدا ہوتا ہے، زندگی میں نہیں۔  
 چنانچہ یہ اصول بھی قطعی اصول ہے کہ کسی کی زندگی میں کوئی دوسرا اس کا وارث قرار نہیں پاسکتا

رقیہ حاشیہ ۳۱۷) یہ قاعدہ قرآن کے صریح منصوص احکام پر مبنی ہے۔ میت کی اولاد نہ دیکھنے کی صورت میں اس کی بیٹیوں کے ساتھ بہن کا عصبہ ہونا ایک استثنائی صورت ہے جو حدیث پر مبنی ہے۔



بلکہ اس کے مرنے کے بعد وراثت کا حق پیدا ہوتا ہے۔

واضح ہے کہ یہ متفق علیہ اور قطعی اصول طبعی تنظیم پوتے کے مسئلے پر پوری طرح اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کا باپ اپنے باپ کی زندگی میں وراثت نہیں تھا، لہذا اس کا کوئی حق ثابت نہیں۔

چھٹا کلیہ | اوپر کے کلیے کے منطقی نتیجے کے طور پر دوسرا کلیہ یہ بنتا ہے کہ کسی بھی مرنے والے کے ترکہ میں حق وراثت صرف زندہ وارثوں کا ہوتا ہے، مرنے والے ممکن وراثت کو مرنے سے محسوب ہی نہیں کیا جاتا۔

یہ کلیہ بھی نصوص قرآنی کی قطعی دلالت پر مبنی ہے۔ آپ خود غور کیجیے کہ قانون میراث کو بیان کرنے والی آیات (نیز احادیث) میں جہاں یہ الفاظ آتے ہیں کہ للرجال نصیب، تو ان موقعوں پر کیا مدعا اور عمقوں سے مراد زندہ مرد اور زندہ عورتیں ہیں یا زندہ کے ساتھ مردہ بھی؟ اسی طرح "یوصیکم اللہ فی اولادکم" میں بات زندہ اولاد کی ہے یا زندہ و مردہ دونوں کی؟ پھر اسی طرح "فان کن نساء فکنتن" میں بیان زندہ عورتوں کا ہے یا زندہ و مردہ و طفل کا؟ اسی طرح "وان کانت واحدة" ان کا من لہ ولد، "فان لکم ولدا"، "فان کان لہ اخوة"، "ان لکم لکن ولدا"، "ان لکم لکن ولدا"، "فان کان لکم ولدا"، "ولہ اخ واخوات"، "فان کانوا اکثر من ذلک"، "لیس لہ ولد ولہ اخ"، "ان لکم لکن ولدا"، "فان کانتا اثنتین"، "وان کانتا اخوات رجالا ونساء" کے تمام حکموں کو سامنے رکھتے اور فیصلہ کیجیے کہ اگر فلاں رشتہ دار مرے سے کیا یہ مدعا نکالا جاسکتا ہے کہ کبھی پہلے موجود رہا ہو، یا نہ فلاں رشتہ دار نہ ہو؟ یہ مفہوم بھی پیدا کیا جاسکتا ہے کہ اس قسم کا رشتہ دار مرے سے پیدا ہی نہ ہوا ہو اور کبھی پہلے طبعی وجود نہ رکھتا ہو؟ اگر کوئی شخص کہے کہ ہاں یہ مفہوم بھی نکالا جاسکتا ہے تو سب سے پہلے تو ہم اسے عربی زبان و ادب کا لحاظ کرنے پر توجہ دلائیں گے، پھر اسے یہ تباہی لگے کہ آج تک کوئی ایک فرد بھی قدر نبوی سے لے کر اب پیدا نہیں ہوا جس نے اس انوکھے اجتہادی مفہوم کی گنجائش کہیں سے ڈھونڈ لکالی ہو۔ لیکن اس پر بھی اگر کثرت اجتہاد نہ آئے تو ہم ذیل

علم برطانی قانون وراثت میں بھی یہ اصول اسی طرح زیر عمل ہے

کی تصریح سامنے رکھ کر پڑھیں گے کہ من پر کس طرح آپ کا مفہوم منطقی ہو سکے گا۔

(۱) **وَإِن كَانَ رَجُلٌ يُؤْتِرُكَ كِلَانًا أَوْ صِمَاةً فَلَهُ أَمْ وَالْحَتُّ** (ترجمہ: اگر کوئی مرد یا عورت اس حالت میں ترکہ چھوڑے کہ وہ کلالہ ہو، یعنی نہ اس کا باپ زندہ ہو، نہ بیٹا بلکہ اس کے بھائی یا بہن ہوں تو) میں کیا یہ نص قرار کیا جاسکتا ہے کہ مرے سے کوئی شخص عیسیٰ علیہ السلام کی طرح بے باپ کے پیدا ہوا ہو گا یا ظاہر ہے کہ باپ تھا اور مر گیا، لہذا اس کے وارث ہونے کا سوال خارج از بحث ہو گیا۔

(۲) **وَإِن لَّمْ يَكُن لَّهُ وَلَدٌ وَوَرِثَتْهُ الْوَالِدَاتُ** (یعنی اگر اس کے اولاد نہ ہو اور اس کے وارث اس کے والدین ہوں تو اس کی ماں کا حصہ ہو گا) میں کیا والدین مردہ ہونے کی صورت میں بھی وارث ہو گئے؟ اور یہ حصہ اس کی ماں کا شمار کیا جائے گا؟

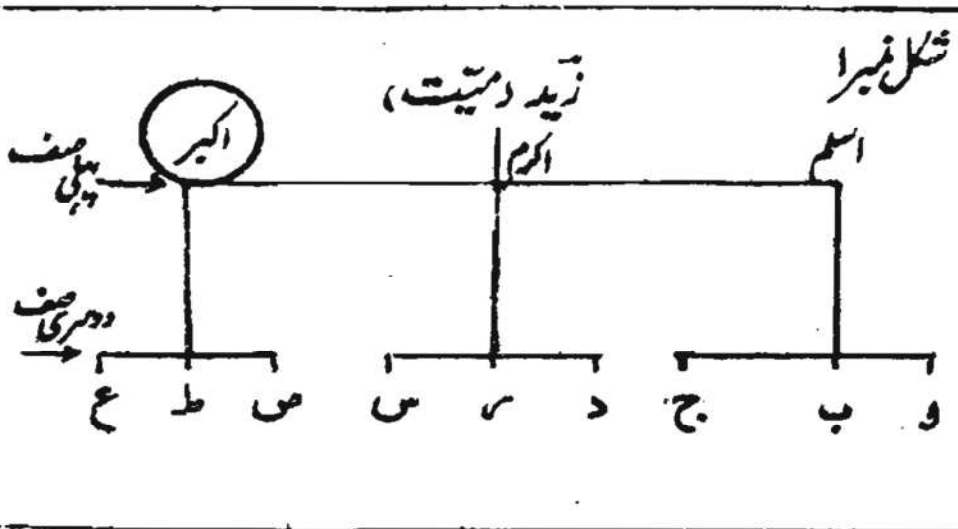
(۳) **عَدِيثٌ: لِلنِّسَالِ وَارِثَاتُ مَنْ لَّا وَارِثَ لَهُ** (ماحول وارثہ جو اس کا حین کا کوئی وارث نہ ہو) میں کیا من لارثت سے مراد یہ ہے کہ حین کا کوئی زندہ یا مردہ وارث موجود نہ ہو اس کا وارث من ہو گا یا بات صرف زندہ وارث تک محدود ہے؟ اور زندہ اشہر کے نہ ہونے کی وجہ سے من کی ماں ہے نیز کیا خود خال شہرہ لارثہ من بھی لیا جاسکتا ہے جو میت کی وفات سے پہلے مر گیا ہو؟

(۴) **عَدِيثٌ: - بِرَوَايَةِ ابْنِ بَرِيْدَةَ، عَنْ أَبِيهِ، أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَعَلَ لِلْحَيَّةِ السُّدْسَ إِذَا لَمْ يَكُنْ دُونَهَا** (یعنی نبی صلعم نے داری کے لیے چھٹا حصہ مقرر کیا ہے جبکہ اس کے ساتھ ماں موجود نہ ہو) میں کیا اذا لَمْ يَكُنْ دُونَهَا سے مراد یہ لیا جاسکتا ہے کہ میت کی مرے سے ماں چھپی نہیں، یا صاف صاف مطلب یہ لیا جائے گا کہ ماں تو ہوتی ہی چاہیے لیکن وہ اس سے پہلے چھپی ہو پس اس معاملے میں پوری اہمیت متفق ہے کہ وارث کے حق کی بحث کا تعلق صرف ان زندہ وراثت سے ہے جو کسی عورت کے مرنے پر موجود ہوں۔ پہلے کے مرے ہوؤں کا کسی طرح کا استحقاق مرے سے شریعت اسلامی کے نظام قانون میں نہیں پایا جاتا۔ اس طرح کے غیر عقلی استحقاق کی مثال اگر ہے تو ہندوستانہ مدہجی قانون میں ہے۔ اب اگر کسی کہ بہ ہندوستانہ مدہجی قانون پسند ہو تو مرے سے شریعت کو چھوڑ کر اسے اختیار کر سکتا ہے، لیکن اس ہندوستانہ مدہجی قانون کے اجزا کو اگر شریعت کے قانون میں پڑھیں تو سنا واضح رہے کہ یہ کلیہ بھی عیقہ ہونے کے زیر بحث مشے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اسے توڑنے بغیر

شہ یہ صورت فراموشی قانون میں بھی پائی جاتی ہے۔

ہم کسی طرح اُسے وارث نہیں بنا سکتے :-

صورتِ مسئلہ | جن کلیوں کو ہم نے ایک ترتیب کے ساتھ مختصر سا استدلال کر کے پیش کیا ہے وہ کچھ کتاب و سنت کے نصوص پر مبنی ہیں۔ ان کلیوں ہی کا عمل ہے جو تقسیم پوتے کو زندہ چھاپوں کے ساتھ حقیقی وراثت دلوانے میں مانع ہے۔ فرض کیجیے کہ زید کے تین بیٹے اسلم، اکرم، اور اکبر تھے۔ اسلم زید کی



زندگی میں اس کے ترکے کی تقسیم سے قبل فوت ہو گیا۔ اب زید کے دو بیٹے اسلم اور اکرم موجود ہیں، اوصاف کے ساتھ اسلم کے بیٹے و، ب، ج، اکرم کے بیٹے د، س، ص، اور اکبر

کے بیٹے ص، ط، ع بھی ہمارے سامنے ہیں۔

زید کی موت پر جب ہم مستحقین میراث کی تلاش میں نکلتے ہیں تو آگے پیچھے دو صفیں ہمارے سامنے آتی ہیں پہلی صف زید کے بیٹوں اسلم اور اکرم کی ہے، اور دوسری صف زید کے پوتوں د، ب، ج، د، س، ص، ط، ع کی ہے۔ ہمارے قانون میراث کے ثابت شدہ اور نہایت درجہ معقول کلیات اور تقاضوں کا تقاضا یہ ہے کہ جب تک پہلی صف میں مرتبہ عصوبت دادنی رجل ذکور رکھنے والا ایک وارث بھی موجود ہو، دوسری صف کا کوئی فرد ترکہ نہیں پاسکے گا۔ کیونکہ اسلم اور اکرم کا تعلق زید سے بلا واسطہ ہے، لیکن و، ط، ع کی صف دوم کے جملہ افراد کا تعلق بالواسطہ ہے۔ آپ کا جذبہ رحم | لیکن آپ کے ذہن میں صرف پوتے کا تصور کارفرما نہیں، بلکہ منکرین حدیث نے اُس کے ساتھ اسم صفت "تیمم" لگا کر مسئلے کو بڑی جذباتی شکل دے دی ہے۔ کوئی نہیں سوچتا کہ اول تو تقسیم وراثت کے مجموعی واقعات میں پوتے کا ایسا مسئلہ کئے فیصد صورتوں میں پیدا ہوتا ہوگا،

بہر تہنیم صورتوں میں تو بائع اور صاحب اولاد ہوگا اور اپنا کاروبار اپنی املاک اور اپنے والد سے بلا  
 بڑا ترکہ رکھنا ہوگا اور یہ بھی کوئی نہیں سوچتا کہ کتنی صورتوں میں داد امرتے ہوئے جائداد کے بجائے  
 ذمہ داریاں (LIABILITIES) چھوڑ کر رخصت ہوگا لیکن موجودہ پروڈیگنڈے کی ہم آپ کے ذہن  
 میں نگوٹھا چوستا ہوا ایک تنہا سائیم لاکھڑا کرتی ہے، آپ کو اس پر رحم آتا ہے، آپ کے جذبات  
 اترتے اٹتے ہیں، اور آپ سوچتے ہیں کہ خدا کا قانون کبھی ایسا بے مہر نہیں ہو سکتا کہ تہنیوں کو یوں  
 بے کسی کی حالت میں ڈال دے، جبکہ شریعت میں تہنیوں کو سہارا اہم پہنچانے کے لیے خود خدا اور رسول نے  
 جگہ جگہ تاکید کی ہے۔ یہاں تک کہ مستس حالی کا ایک مشہور جذبہ وہ تہنیوں میں رحمت لفتب پانے والا  
 آپ کی زبان پر آجاتا ہے۔ پھر آپ کو خیال آتا ہے کہ ہونہ ہر خدا کے قانون کو سمجھنے میں غلطی کی گئی ہے،  
 یا واقعی من گھڑت روایات کہ قانون الہی کے ساتھ گڈ ٹرکروا گیا ہے جس کی وجہ سے ہمارے نظام فقہ  
 قانون میں ایسے ایسے مضحکہ انگیز مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

مگر جب آپ ذرا تامل سے کام لے کر سوچیں گے اور اَلْأَقْرَبُ مَا لَاقْرَبُ کے عین قرآنی اصول  
 کا عمل، نیز حجب حرمان کا اثر مختلف صورتوں میں ملاحظہ فرمائیں گے تو رحم کے بے شمار مواقع سامنے آئیں گے۔  
 یہاں تک کہ اگر حدیث و سنت سے آپ قطعی انکار کر کے منکرین حدیث کا وہ خالص قرآنی نظام قانون  
 بھی اپنائیں تو بھی اس طرح کی "قابل رحم" اور "مضحکہ انگیز" صورتوں سے نجات نہیں۔ مثلاً ایک شخص کے  
 ممکن وراثہ میں اگر بیٹا — اور بیٹیا ہی نہیں، پوتنا، پوتنا — موجود ہو تو اس کی سگی بہن اپنے قریبی  
 تعلق کے باوجود محرم رہے گی، پھر اگر وہ بیوہ بھی ہو تو آپ کہیں گے کہ "آہ! بیوہ بہن محروم ہے" —  
 "خدا کا قانون ایسا بے مہر نہیں ہو سکتا، دراصل لیکہ میراثوں کو سہارا اہم پہنچانے کی تاکید کی گئی ہے"۔ اسی  
 طرح تو اسی رحیم کی والدہ اپنے والد کے ترکہ کی تقسیم سے قبل فوت ہو گئی ہو بھی قابل رحم ہے۔ پھر تہنیم  
 بھانجوں بھانجیوں اور بھتیجیوں بھتیجیوں کی محرومی بھی جذبات ہمدردی میں حل پیدا کر سکتی ہے۔ نیز آپ یوں

سلہ علاوہ بریں نکاح و طلاق، رضاعت و کفالت اور مضاربت، مشارکت وغیرہ کے قوانین میں بلکہ دنیا کے ہر  
 قانونی نظام کے ہر شعبے میں بے شمار مواقع رحم پیدا ہو سکتے ہیں۔ اب اگر قانون کو جذبات کا کھلونا بنایا جائے گے تو  
 سوچئے کہ کوئی قانون بھی حل سکتا ہے؟

بھی سمجھ سکتے ہیں کہ جہاں کہیں کوئی یتیم یا بیوہ یا بے کس آپ کو نظر آئے، آپ تقاضا کریں کہ قانون شرعی میں اسے بھی کسی نہ کسی کا وارث بنا دیا جانا چاہیے۔

اب اگر آپ کے جذبہ رحم کی ہر لہر کو اس کا کھلا موقع دے دیا جائے کہ وہ کلیات اور فارمولوں اور نظام فقہ و قانون کے پوتے ڈھانچے کو توڑتی پھوڑتی جدھر سے جدھر چاہے بڑھتی جائے تو خیال فرمائیے کہ ایک خبرنی پیمیدگی کو حل کرنے کے لیے آپ نکل کو تباہ کر ڈالیں گے۔

**اجماع** | آپ کے جذبہ رحم کے تقاضے کے جواب میں علماء آپسے یہ کہتے ہیں کہ یتیم پوتے کو اس کے چچاؤں کی موجودگی میں ترکہ میں سے حصہ نہ دینے پر اجماع ہے۔ اس سے ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسلامی قانون وراثت جن کلیات اور فارمولوں سے بنا یا گیا ہے اور جن کے قائم رہتے ہوئے یتیم پوتے کو حصہ دلوانے کا کوئی راستہ نہیں اور کلیات اور فارمولے ایسے ہیں کہ بالکل منفق علیہ ہیں اور انہی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسلامی حکومتوں کے نظام عدلیہ نے ان اہل تا آخر یتیم پوتے کو اس کے چچاؤں کے پہلو بہ پہلو کبھی وارث تسلیم نہیں کیا ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ یتیم پوتے کی وراثت کا یہ زیر بحث مسئلہ کسی خاص دور یا ملک کے حالات میں اپنی نوعیت تبدیل نہیں کرتا اور نہ حالات کے اختلاف سے متاثر ہوتا ہے، لہذا یہ کوئی اجتہاد کرنے کا میدان نہیں ہے کہ آپ یہ کہیں کہ پہلے ایک اجتہاد کیا گیا تھا جو نئے حالات میں اپنے اندر تبدیلی چاہتا ہے لہذا ہم از سر نو اجتہاد کرتے ہیں یہ مسئلہ (قانون وراثت کے بیشتر مسائل کی طرح ایک ٹھوس اور مستقل مسئلہ ہے۔ اس لیے اس میں تبدیلی کرنے کے لیے علماء کے دعوے کو توڑنا صرف اس طرح ممکن ہے کہ آپ یہ ثابت کریں کہ اس مسئلے کو موجودہ شکل دینے والے کلیات اور فارمولے ہی غیر اسلامی یا نامعتبر ہیں

۱۔ منکرینِ حدیث کی طرف سے یہ جملہ (ATTEMPT) کیا تو کیا ہے مگر اس حد تک نہیں کہ وہ مذکورہ بالا کلیات کا کامل رد کریں، ان کو تسلیم کرنے پر وہ بھی مجبور ہیں بس وہ چند تفصیلی جزئی مشاغل میں جا کر یہ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ خود فقہانے ان میں سے ہر کلیہ کی خلاف ورزیاں کی ہیں اور ان خلاف ورزیوں کو بیان کرتے ہوئے وہ کبھی اشعار چسپاں کر کے اور کبھی طنز کر کے ان کا مضحکہ بھی اڑاتے ہیں۔ لیکن ایسے بائیک مواقع پر پوزیشن درحقیقت یہ ہوتی ہے کہ ایک مسئلہ میں بیک وقت دو یا تین کلیوں کا

یا ان کی بنیاد نصوص کے تقاضوں اور اشارات پر نہیں ہے یا ان پر وہ حقیقت اجماع ہی نہیں ہے بلکہ وہ اختلافی اور قابل بحث و نظر ہیں۔ یا دوسری صورت یہ ہے کہ نصوص، آنحضرت صلیم کے فیصلوں، اسلامی مجالس شوریٰ اور اسلامی عدلیہ کے فیصلوں میں سے آپ کوئی نظیر ایسی ڈھونڈ کے لے آئیں جس سے یتیم پوتے کو اس کے چچاؤں کی موجودگی میں وراثت دلوانا ثابت ہو سکے۔ اس صورت میں اگر ہمارے قانون میراث کا ڈھانچہ شکست و ریخت سے دوچار ہوتا ہو تو یہ آپ کا کام ہے کہ اس ڈھانچے کو نئے کلیات اور فارمولوں سے از سر نو ترتیب دیں۔ لیکن اس معقول اور مستحکم روش (APPROACH) کے بجائے اگر آپ صرف جذبہ رحم کا مظاہرہ کرتے پھریں اور لوگوں سے کہیں کہ ”دیکھو جی یتیم پوتا محروم ہے یہ ملاؤں کی سازش ہے، یہ روایات کا فتنہ ہے، مگھی پر لکھی ماری جا رہی ہے“ تو ایسے مذاق اور ایسی شاعری سے قانون کے مسائل کو حل نہیں ہو سکتے۔

ایک چیز جسے رسول اللہ صلیم کے دور سے لے کر خلفائے راشدین، اور تابعین کے تمام ائمہ میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۲۳)

عمل صحیح ہو جاتا ہے اور سوچنا یہ ہوتا ہے کہ مسئلہ پر کس کلیے کا حاکم کرنا اہم تر ہے اور کس کو کم اہمیت کی وجہ سے چھوڑا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ایسے مواقع پر اختلاف بھی ناگزیر ہو جاتا ہے اور اس طرز کے پیچیدہ مسائل میں ہمارے مدارس فقہ کا پہلے سے اختلاف موجود ہے اور آئندہ بھی موجود ہے گا۔ مگر نہ پہلے تفصیل کے فنی اشکالات اور ان پر پیدا ہونے والے اختلاف کی وجہ سے کسی نہ ان کلیات کی صحت و اہمیت سے انکار کیا ہے، نہ آج ایسا کرنا صحیح ہے۔ دنیا کے ہر نظام قانون میں، بلکہ ہر شعبہ زندگی کے عوام و فنون میں کلیات کو باریک تفصیلی و جزئی امور میں منطبق کرتے ہوئے یہی صورت پیش آتی ہے۔ لیکن کبھی بھی اہل علم بنیادی مستحکمات کو جزئی اشکالات کی بنا پر منسوخ یا اگیز نہیں قرار دیتے۔ لیکن یہ ہمارے منکرین حدیث خوب لوگ ہیں یہ ہمارے علمائے قانون کی کتابوں میں سے چھانٹ چھانٹ کر وہ حصے نکال لاتے ہیں جن میں اعتراضات اور اشکالات زور دیاں کے ساتھ سامنے لائے جاتے ہیں لیکن ان کے ساتھ وہ اعتراضات کیے جو جانتے ہیں اور اشکالات کو جس طرح حل کئے ہیں ان حصوں کا باقاعدہ ایک ٹیٹ اپ کر دیا جاتا ہے یا ان کے حوالہ پر حوالہ دیکر پیش کیا جاتا ہے اس طرح فقہ اور حدیث کے خلاف اشارے بھی پیدا کرنے میں کامیابی ہوتی ہے اور علمیت و تفکر کی دھولیں بھی قائم ہو جاتی ہے۔





اولاد میں داخل طور پر بھی فرق مراتب پیدا کرتا ہے۔

صورت سوم۔۔۔۔۔ یہ ہے کہ ہم منکرین حدیث کے نظریہ قائم مقامی کو اختیار کر لیں لیکن پہلے اس نظریے کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فقہائے متقدمین نے خود قائم مقامی کا نظریہ اختیار کیا ہے۔ یعنی جو تعلق بالواسطہ ہونے کی وجہ سے مرتبہ ثانی پر ہوتا ہے وہ واسطہ کے بیچ میں سے ہٹ جانے پر مرتبہ اول پر آ جاتا ہے۔ جیسے ابو بکر ابن عباس کے قول "الْحَجْدُ ابْتُ دَاوُدَ بِمَنْزِلَةِ بَابِ كَيْسَانَ" کے تحت باپ کو ہٹنے والی میراث داد کے حصے میں جاتی ہے۔ اگر باپ کی خالی جگہ کو دادا پر کر سکتا ہے تو بیٹے کی خالی جگہ کو پوتا کیوں نہیں کر سکتا۔ دونوں صورتیں ایک دوسرے کا عکس ہیں تو جو فارمولہ ایک طرف چلتا ہے وہی دوسری طرف چلنا چاہیے۔ بڑا معقول استدلال ہے اور بڑا منصفانہ تقاضا ہے، مگر یہ جن مغالطوں کو اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے ان کا تجزیہ کیسے بغیر ہم کو ٹی جی تلی رائے قائم نہیں کر سکتے۔

اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ اصول اور فروع میں یہ مسئلہ کیساں نہیں بیٹھتا، بلکہ دونوں طرف بڑا فرق ہے۔ فرق یہ ہے کہ اصول میں مذکور (MALES) کی اقرب ترین صف کے اندر باپ ہمیشہ صرف ایک ہی پایا جاتا ہے، کسی کے دو یا چار، یا چھ باپ نہیں ہوتے، اسی طرح اس کے بعد کی صف میں دادا بھی صرف ایک ہی پایا جاتا ہے، پان، سات، دس میں نہیں ہوتے (ہم باپ کے چچاؤں کو دیکھنا دیکھتے ہیں) چنانچہ وہاں مسئلہ یہ نہیں پیدا ہوتا کہ دو تین باپوں میں سے اگر ایک مر گیا ہو اور اس کا باپ (یعنی میت کا دادا) باقی ہو تو میت کے باپوں کے ساتھ اس دادے کو بھی وارث بنایا جائے یا نہیں۔

لہ دیکھا آپ نے؛ قانون کا مزاج ہی کلیات پسند ہے۔ جہاں ایک جزئی نظیر سامنے آئی تو ناگزیر ہو جاتا ہے کہ اس سے کلیہ بنے اور وہ سامنے قانون پر چھپا جائے۔ آپ اگر پوتے کو بیٹوں کے ساتھ وارث قرار دینے کی نظیر ایک مرتبہ قائم کر دیں تو لازماً یہ نظیر ایک یا چند کلیات کو جنم دے گی جن کی فطرت سامنے قانون پر چھپانے کے لیے زور کرے گی۔ پھر اگر پوتے کلیات سابق کلیات سے متضاد ہوتے تو پوتے کو دھپنچے کو تہ وبالا کر دیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر قانون میں کوئی نئی اجتہادی نظیر قائم کرتے ہوئے بڑی احتیاط سے کام لیا جاتا ہے۔



تک صف اول میں ایک متنفس بھی موجود ہوگا وہ صف دوم کے بیٹے حاجب ہوگا۔ ملاحظہ فرمائیے شکل

شکل ۳	جمید میت
صف اول: (رحیم) ... (شریف) ... حکیم ... حبیل ... قدیر	
صف دوم: لطیف ... (سیم) ... نسیم ... ویم ... جمید ... (علیم) ... کریم ... عیم	
صف سوم: نفیس ... علیم ... تذیر ... بشیر	
نوٹ: ترکہ کی تقسیم کے وقت جو لوگ فوت شدہ تھے ان کے ناموں کے گرد دائرہ ہے۔ اور صف سوم زیر بحث ہی نہیں آئے گی۔	

”قائم مقام“ (وارث) دراصل نیچے کی طرف سے نہیں تحقیق کیے جانے کہ نفیس اور علیم کس کے قائم مقام یا وارث ہیں، بلکہ اوپر کی طرف سے دیکھا یہ جانا ہے کہ جمید (میت) کے قائم مقام یا وارث اولین مرتبہ پر کون لوگ ہیں۔

گویا باپ اور دادا والی صورت بیٹوں اور پوتوں والی صورت پر منطبق نہیں ہوتی کہ اُس سے قیاس کے یہاں کوئی فیصلہ کیا جاسکے۔ لیکن کہا جاسکتا ہے کہ فقہائے متقدمین نے خود ابن الابن کو بھی تو ابن قرار دیا ہے، لہذا شکل ۳ کے مطابق، اگر کے مر جانے کی صورت میں زید کے پوتوں ص، ط اور ع کو اگر اکبر کے مقام پر رکھا جائے تو اس میں کیا ہرج ہے۔ اچھا فرض کر لیجئے کہ ہم اس اجتہاد کو مان لیتے ہیں۔ اب ہوگا یہ کہ اسلم، اکرم، ص، ط اور ع میں زید کا ترکہ بالکل کیساں تقسیم ہوگا کیونکہ ہم نے اپنے سمجھے ہوئے فارمے کے مطابق اکبر کا درجہ اس کے پوتوں کو دیا ہے، یا بالفاظ دیگر ان کو صف دوم سے اٹھا کر صف اول میں لاکھڑا کیا ہے۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ اگر اس تقسیم کے بعد اکرم یا اسلم مر جائے تو ان کے بیٹوں کا حصہ اکبر کے بیٹوں سے بہت کم رہے گا، نیز اسلم اور اکرم کی بیویوں تو ان کے ترکہ میں سے کچھ پالیں گی، لیکن اکبر کی بیوہ کو کچھ نہ ملے گا۔ خیر، ان اثرات کو الگ لکھتے ہوئے

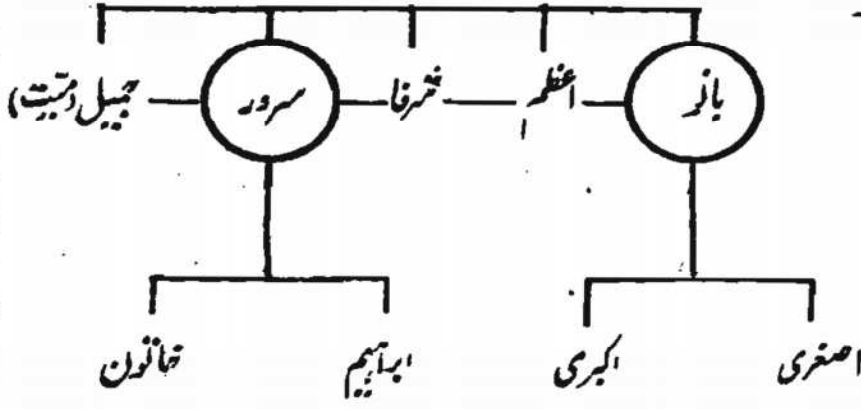
اصولی حیثیت سے غور کیجیے۔ ہم یہ کلیہ پہلے سوچ سمجھ کر طے کر آئے ہیں کہ بروئے حدیث "اولیٰ رجل ذکرتہ" جب تک مرتبہ عصوبت پر موجود ہو تو اس سے درجہ میں نیچے کے جتنے ممکن وارث بھی ہوں، وہ کچھ نہیں پاسکتے تو ہمارے قائم مقامی کے نظریے کا عمل اس کلیے کو ختم کرنا ہوا خود حدیث صریح کہ با مال کر دیگا۔ زید کے وارثوں میں ذوی الفروض کوئی بھی نہیں کہ جس کا حصہ اہل مقدار میں متعین ہو، بلکہ اس کے وارث عصبات کی نوعیت کے ہیں۔ ان عصبات میں مرتبہ اول پر دو بیٹے ہیں، مرتبہ ثانی پر ہوتے۔ اب جب تک مرتبہ اول پر بیٹے موجود ہیں، پوتے کچھ نہیں پاسکتے، چاہے وہ یتیم ہوں، کوسے لنگڑے ہوں، یا کسی اور مصیبت میں مبتلا ہوں۔

صورت چہارم — یہ ہے کہ منکرین حدیث کے نظریہ قائم مقامی کا وہ دوسرا تصور اختیار کیا جائے جو ہندو و راجی قانون سے ماخوذ ہے، اور جو اخباری بحثوں میں زیادہ تر پیش کیا جا رہا ہے، نیز جس پر خود چیمہ صاحب کا ترمیمی مسودہ قانون مبنی ہے۔

وہ تصور یہ ہے کہ یتیم پوتا اگرچہ بدایت خود وارث نہیں، لیکن وہ اپنے باپ کا حصہ داد سے لینے کا حق دار ہے۔ یعنی اس تصور کو قبول کرنے کے لیے ہمیں شریعت اسلامیہ کا یہ بنیادی کلیہ ختم کرنا ہوگا کہ کسی شخص کی زندگی میں اس کے مال پر کسی کا حق میراث قائم نہیں ہوتا اور اس کلیے کو بھی ختم کرنا ہوگا کہ یتیم ترکہ کے وقت زندہ وراثہ کے ساتھ کسی مردہ وارث کو مستحق بنا کے کھڑا نہیں کیا جاسکتا۔ اور ان دو کلیوں سے آزاد ہو کر جب ہم قانون سازی کریں گے تو ایک یتیم پوتے کے لیے ہی مردہ باپ کا حصہ زندہ نہیں رکھنا ہوگا بلکہ کسی مردہ وارث کے جو بھی ممکن حقدار مثلاً بیوی، ماں، بہن، بھائی وغیرہ موجود ہوں، وہ سب حصہ لینے کے حقدار ہونگے۔ اس تبدیلی کا اثر واضح کرنے کے لیے ہم چند مثالیں پیش کرتے ہیں:-

مثال ۱۔ جمیل کے دو بھائی اور ایک بہن زندہ ہیں (والدین اور اولاد زندہ نہیں) تیسرا بھائی اس کی وفات سے قبل فوت ہو چکا تھا اور اس کی اولاد ہے۔ شکل ۱ کے لحاظ سے موجودہ شرعی قانون اعظم اور شرفا اور بانو میں پورا ترکہ تقسیم کر دیگا اور ابراہیم (بھتیجا) اور خاتون (بھتیجی) اور اصغری

شکل ۴

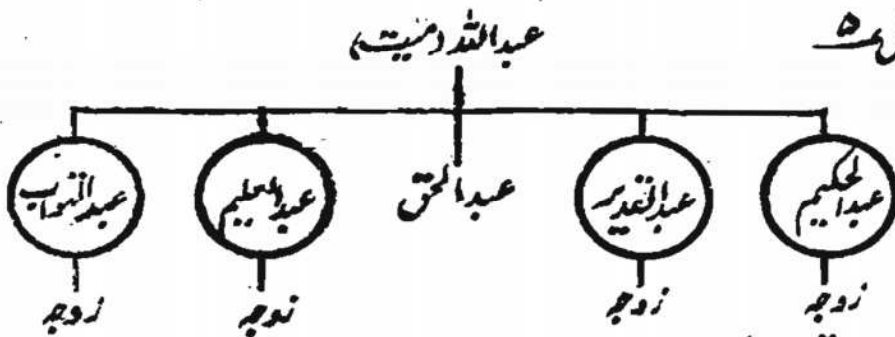


اور اکبری (بھانجیاں) کچھ نہ پائیں گی۔ بخلاف اس کے نئی اصلاح جو تجویز کی جا رہی ہے وہ اعظم اور سرد کے ساتھ ابراہیم، خاتون اور اصغری و اکبری سب

کو وارث بناتی ہے۔ بھائیوں کے ہوتے ہوئے بھتیجیوں اور بھانجیوں بھانجیوں کا شریک میراث ہونا ہمارے نظام قانون کے لیے بالکل انوکھا تصور ہے۔

مثال ب۔ اوپر شکل ۴ میں ہم نے جو صورت مسئلہ پیش کی تھی اس میں اکبر کے زندہ حصہ کو پانے والے قائم مقام صرف اس کے بیٹے ص، ط، ح ہی نہیں، اس کی بیوہ بھی ہو سکتی ہے۔ فرض کیجیے کہ ہم نے اسے اس کا حصہ دیا۔ اب زید کی زندہ شوہروں والی دو بیویاں تو محروم رہیں گی اور ایک بیوہ بہرورثہ پانے گی۔ نیز زید کے بیٹوں کے ہوتے ہوئے ان کی تھانج کا شریک میراث ہونا پھر ایک ایسا واقعہ ہے جو اسلامی نظام وراثت میں قطعی طور پر نئی چیز ہے۔ اور فرض کیجیے کہ اکبر کی کوئی اولاد سرے سے موجود ہی نہیں، صرف ایک بیوہ ہے۔ یہ بیوہ اسلم اور اکرم کے ساتھ اکبر کی قائم مقامی کی بنا پر برابر کا حصہ پائیگی۔ کیا یہ ایک معقول قانون ہوگا جو بیٹوں اور بیوہ کو ہم مرتبہ کرے؟ اور آگے چلیے، فرض کیجیے کہ زید کے پانچ بیٹے تھے جن میں چار اولاد صرف بیوہ یا بیٹوں چھوڑ کر والد سے قبل وفات پا گئے، اور ایک زندہ ہے۔

شکل ۵

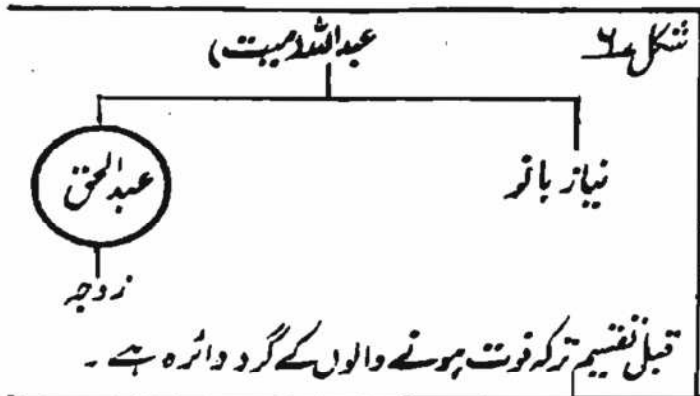


اب چاروں بیوہ بہوؤں میں سے ہر ایک کو اس کے زندہ بیٹے کے مساوی حصہ ملے گا، حالانکہ اگر اس کی بیویاں بھی ہوتیں تو ان میں

(نوٹ) قبل تقسیم ترکہ مر جانے والوں کے ناموں کے گ۔ و دائرہ سے

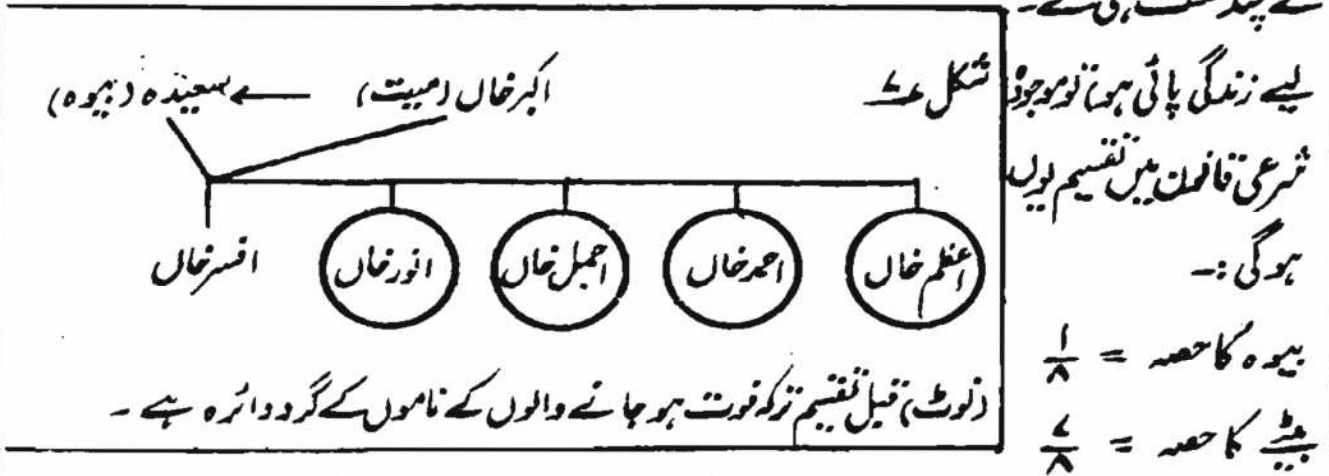


سے کوئی اپنے بھائی کے برابر حصہ نہ پاسکتی۔ بڑا معقول ہوگا وہ اجتہاد جو بہروں کو بیٹیوں سے بھی زیادہ آفرین بنا دے۔ ملاحظہ ہو شکل ۵۔ عبدالحق کے ساتھ بیوہ عبدالقدير، بیوہ عبدالعکیم، بیوہ عبدالقواب، بیوہ عبدالعظیم بالکل مساوی درجہ کی حصہ دار ہیں۔ اب  $\frac{1}{8}$  ترکہ وہ لیں گی اور  $\frac{1}{8}$  عبدالحق کو ملے گا۔ اس فرق کو شکل ۵



مزید واضح کرے گی۔ عبد اللہ کے ترکہ میں دو حصہ دار ٹھہرے۔ ایک نیاز بانو، دختر، دوسرے بیوہ عبدالحق بحیثیت قائم مقام عبدالحق۔ اور لطف یہ کہ بیٹی سے بہو کا حصہ دگنا ہو گیا۔ مثال ج۔ کسی میت کی بیوی کے ہوتے

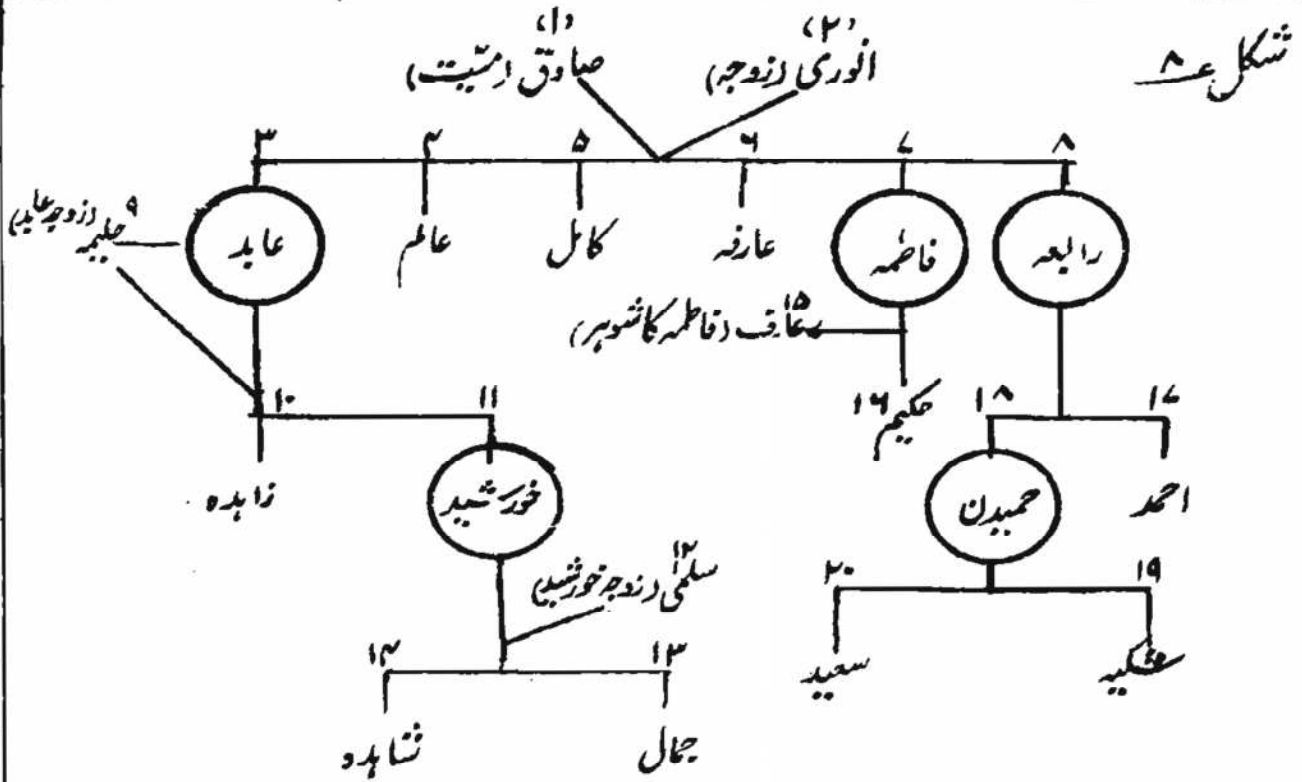
ہوتے اگر ایک ہی بیٹیا زندہ ہو، اور چار اس کی ذوات سے قبل ذوات چھکے ہوں (چاہے انہوں نے چند منٹ ہی کے



یعنی شکل ۶ کے بموجب  $\frac{1}{8}$  سعیدہ لے گی اور  $\frac{4}{8}$  افسر خاں کو ملے گا۔ لیکن نئی اجتہادی صورت میں تقسیم یوں ہوگی :-

$$\begin{aligned} \text{سعیدہ (بیوہ میت) کا اپنا حصہ} &= \frac{1}{8} \quad (\text{باقی} = \frac{7}{8}) \\ \text{مردہ بیٹیوں کا زندہ شمار کیا جانے والا حصہ} &= \frac{4}{8} \quad \text{کا} \quad \frac{4}{8} = \frac{8}{8} \\ \text{سعیدہ کے حصے میں مردہ بیٹیوں کی قائم مقامی} & \\ \text{کی وجہ سے مزید حصہ ملا دیا} &= \frac{4}{8} + \frac{1}{8} = \frac{5}{8} \end{aligned}$$

میت کے زندہ بیٹے افسر خاں کا حصہ جو باقی رہا =  $\frac{1}{8} \times \frac{2}{3} = \frac{1}{12}$   
 پہلے ماں بیٹے کے حق میں علی الترتیب ۱ : ۷ کا تناسب تھا، اب الٹ کر ۳۳ : ۷ ہو گیا۔



قبل تقسیم ترکہ فوت ہونے والوں کے ناموں کے گرد دائرے ہیں۔

مثال ۷۔ بصورت موجودہ صادق کے ترکہ کی تقسیم یوں ہوگی؟

انوری زوجہ صادق (۲) = کل کا  $\frac{1}{8}$  (بقیہ  $\frac{7}{8}$  اولاد میں)

عالم بیٹا (۴) کو =  $\frac{2}{3}$

کامل بیٹا (۵) کو =  $\frac{2}{3}$

عارفہ بیٹی (۶) کو =  $\frac{2}{3}$

باقی کسی کو کچھ نہیں ملے گا

جدید مجوزہ صورت میں یہ تقسیم یوں ہوگی :-

صادق کی زوجہ انوری (۲) کو =  $\frac{1}{8}$



بقیہ  $\frac{۷}{۸}$  کی تقسیم اولاد میں: —

$$\frac{۷}{۳۶} = \text{عالم (۳) کو}$$

$$\frac{۷}{۳۶} = \text{کامل (۵) کو}$$

$$\frac{۷}{۴۲} = \text{عارفہ (۶) کو}$$

عابد مرحوم کا حصہ  $\frac{۷}{۳۶}$  =  
فاطمہ مرحومہ (۷) =  $\frac{۷}{۴۲}$  =  
رابعہ (۸) =  $\frac{۷}{۴۲}$  =

یہ حصے زندہ رکھ کر ان تینوں کے قائم مقاموں میں تقسیم کئے جائیں گے

عابد کے زندہ حصے کی تقسیم اس کے قائم مقاموں میں :-

$$\frac{۱۱۹}{۸۶۴} = \text{باقی بچا} \left\{ \begin{array}{l} \frac{۷}{۲۱۶} = \frac{۱}{۴} \times \frac{۷}{۳۶} = \text{ماں انوری (۲) کو} \\ \frac{۷}{۲۸۸} = \frac{۱}{۸} \times \frac{۷}{۳۶} = \text{علیہ زوجہ عابد (۹) کو} \end{array} \right.$$

$$\frac{۱۱۹}{۲۵۹۲} = \frac{۱}{۳} \times \frac{۱۱۹}{۸۶۴} = \text{زابدہ (۱۰) کو}$$

$$\frac{۱۱۹}{۱۲۹۶} = \frac{۲}{۳} \times \frac{۱۱۹}{۸۶۴} = \text{خوشید مرحوم (۱۱) کا حصہ}$$

خوشید مرحوم کا حصہ اس کے قائم مقاموں میں یوں تقسیم کیا جائے گا :-

$$\frac{۲۰۲۳}{۳۱۱۰۴} = \text{باقی بچا} \left\{ \begin{array}{l} \frac{۱۱۹}{۷۷۷۶} = \frac{۱}{۴} \times \frac{۱۱۹}{۱۲۹۶} = \text{خوشید کی والدہ علیہ (۹) کو} \\ \frac{۱۱۹}{۱۰۳۶۸} = \frac{۱}{۸} \times \frac{۱۱۹}{۱۲۹۶} = \text{خوشید کی زوجہ سلمیٰ (۱۲) کو} \\ \frac{۲۰۲۳}{۳۶۶۵۶} = \frac{۲}{۳} \times \frac{۲۰۲۳}{۳۱۱۰۴} = \text{جمال (۱۳) کو} \\ \frac{۲۰۲۳}{۹۳۳۱۴} = \frac{۱}{۳} \times \frac{۲۰۲۳}{۳۱۱۰۴} = \text{شابدہ (۱۴) کو} \end{array} \right.$$

اب ہم فاطمہ مرحومہ (۷) کا زندہ شمار کیا ہوا حصہ اس کے قائم مقاموں میں تقسیم کرتے ہیں :-

$$\frac{۷}{۳۲۲} = \frac{۱}{۴} \times \frac{۷}{۴۲} = \text{فاطمہ کی والدہ انوری (۲) کو}$$

$$\frac{۷}{۲۸۸} = \frac{۱}{۸} \times \frac{۷}{۴۲} = \text{فاطمہ کے شوہر عارف (۱۵) کو}$$

$$\frac{۷}{۸۶۴} = \text{باقی کل (۱۶) کو}$$

اب رابع مرحومہ (۸) کا زندہ شمار کیا ہوا حصہ یوں تقسیم ہوگا:-

$$\text{رابعہ کی والدہ انوری (۲) کو} = \frac{1}{4} \times \frac{2}{214} = \frac{2}{214} = \frac{1}{107} \text{ [باتی بچا} = \frac{35}{214}]$$

$$\text{احمد (۱۷) کو} = \frac{2}{3} \times \frac{2}{214} = \frac{4}{642} = \frac{2}{321}$$

$$\text{حمیدن (۱۸) کا زندہ حصہ} = \frac{1}{3} \times \frac{2}{214} = \frac{2}{642} = \frac{1}{321} \text{ [یہ حصہ حمیدن کے قائم مقاموں میں سے ہے۔}$$

اب حمیدن (۱۸) کا حصہ اس کے قائم مقاموں کو یوں دیا جائے گا:-

$$\text{شکیلہ (۱۹) کو} = \frac{1}{3} \times \frac{2}{642} = \frac{2}{972} = \frac{1}{486}$$

$$\text{سعید (۲۰) کو} = \frac{2}{3} \times \frac{2}{642} = \frac{4}{972} = \frac{1}{243}$$

اب ذرا ان حصہ داروں کے حصے پر نظر ثانی بھی کر لیجئے جن کو ایک سے زیادہ مرتبہ حصے ملے ہیں:-

$$\frac{21}{214} = \begin{cases} \frac{1}{8} = \text{انوری زوجہ صادق (۲) کو شوہر سے} \\ \frac{2}{214} = \text{عابد کے حصے سے} \\ \frac{2}{214} = \text{فاطمہ کے حصے سے} \\ \frac{2}{214} = \text{رابعہ کے حصے سے} \end{cases}$$

$$\frac{22}{1922} = \begin{cases} \frac{2}{486} = \text{حلیمہ (۹) کو شوہر مرحوم کے حصے سے} \\ \frac{119}{4444} = \text{خوشید کے حصے سے} \end{cases}$$

اب دیکھیے کہ اس لحاظ سے تقسیم نے کیا کیا گل کھلائے ہیں:-

۱- صادق کی بیوی کو عام حالات میں  $\frac{1}{8}$  ملتا، مگر اب وہ بیٹیوں کے ہونے سے  $\frac{21}{214}$

پا رہی ہے جو براہ راست نص قرآنی کے خلاف ہے۔

۲- صادق کی بیوی کے پہلے پہلہ اس کی بہو حلیمہ (۹) اور اس کی پڑبہو سلمیٰ (۱۲) وارث ٹھہری

لے ایک قابل غور سوال یہ بھی ہے کہ حمیدن مرحومہ (۱۸) کے قائم مقاموں میں اس کی والدہ رابعہ (۸) کیوں

نہ شمار کی جائے، جبکہ مرحومہ وراثت کا حصہ زندہ تسلیم کیا جائے؛ اور اسی طرح دوسرے موقعوں پر بھی یہی سوال پیدا ہوتا ہے۔

ہیں۔ بیوی کے ساتھ بیٹوں کا وارث ہو جانا آج سے پہلے شریعت میں نامعلوم تھا۔

۳۔ صادق کے بیٹوں کے ساتھ اس کے پوتے پوتیاں بھی، پڑپوتا اور پڑپوتی بھی، نواسا، پڑھاسا

اور پڑنواسی بھی شریک ترکہ ہو گئے۔ اس طرح ایک نئی شریعت وجود میں آتی ہے، نہ کہ اجتہاد!

۴۔ صادق کے بیٹوں عالم (۴) اور کامل (۵) کے ساتھ عارف داماد (۱۵) جو ان دونوں کا بہنوئی

ہے، صادق کے ترکہ کا حقدار بن گیا۔

۵۔ مجموعی فساد یہ رونما ہو گیا کہ ذوی الفرائض اور اولوالارحام باہم بالکل گڈ گڈ ہو گئے۔

۶۔ عصوبت کا سرے سے وہ تصور ہی کا عدم ہو گیا جو نص صریح پر مبنی تھا۔

یعنی آپ چلے تھے محض ایک پوتے کے لیے گنجائش پیدا کرنے کو، لیکن اس مقصد کے لیے

ثقلم مقامی کے نظریہ کے تحت مردہ وارثوں کے حصص زندہ فرض کرنے کا فارمولہ اختیار کیا تو اس

نے شریعت کے قانون کے سارے ڈھانچے کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ اتنا ہی نہیں خود نصوص مجروح ہو گئیں

پھر کیا اس نظریہ کی کوئی جگہ یہاں نکلتی ہے؟

ہم کہتے ہیں کہ حدیث سے انکار کر کے صرف قرآن کو اگر کوئی شخص اوسط درجے کی عقل

کا استعمال کر کے بھی مسائل میراث پر منطبق کرے گا تو اس درجہ کی

پچکانہ فقہ تو پھر بھی پیدا نہ ہوگی۔

مذکورہ بالا صورتیں جو مجذہ نظریہ کے تحت پیدا ہوتی ہیں، ان کے لیے سنت کا انکار کرنے

والے، عام تاریخ امت کے مواد کو کھنکال کر کوئی ٹوٹی بھوٹی ایک آدھ نظیر تو ایک ایک صورت کے

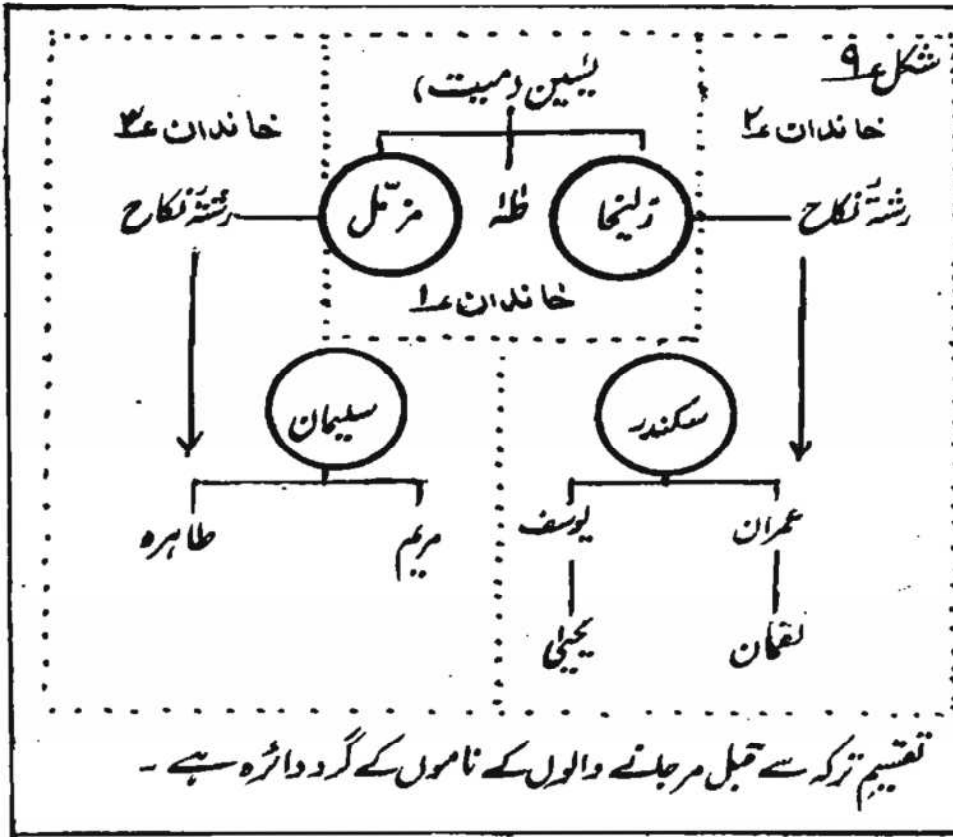
لیے سامنے لائیں۔ کسی شیعہ کا فیصلہ، کسی خلیفہ راشد یا کم سے کم سلطان عادل کا فرمان، کسی

عدالت کا فیصلہ، کسی مستند قانون دان کی علمی رائے، کسی فقہی اسکول کے تحقیقی ادارات کا فتویٰ

کچھ تو ہونا چاہیے۔

مثال ۱۔ خاندان علی کا مورث اعلیٰ وفات پاتا ہے۔ موجودہ شرعی قانون کے تحت اس

کا کل ترکہ اس کا واحد زندہ بیٹا ظہ بوج عصوبت لے گا۔ اور کسی کا کوئی حق نہیں لیکن نئی اجتہادی

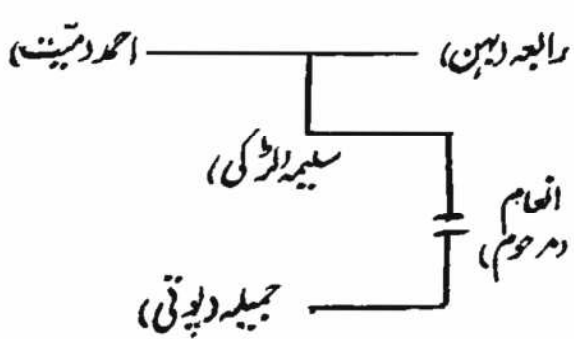


صورت میں ظنہ کو  $\frac{1}{8}$  ملے گا، دوسرا  $\frac{1}{8}$  منزل مرحوم کا زندہ حصہ شمار ہو کر اس کی واحد قائم مقام بیوہ طاہرہ کو جا پہنچے گا اور اگر بالفرض طاہرہ بھی باقی نہ ہوتی تو یہ مریم کو جا ملتا۔ باقی رہا  $\frac{1}{8}$ ، سو یسین کی مرحوم بیٹی زینجا کا زندہ حصہ شمار ہو کر اس کے

قائم مقام بیٹی نعمان کو (جو یسین کا نواسا) جا پہنچے گا۔ اس طرح ایک خاندان کے اندر مرتبہ عصوبت رکھنے والے قریب ترین وارث کی زندگی میں یسین کے ترکہ کا  $\frac{1}{8}$  بالکل ایک الگ خاندان میں اور دوسرا  $\frac{1}{8}$  بالکل ایک الگ خاندان میں دو پار کے ایسے عزیزوں کو جملے گا، جو مرے سے مرتبہ عصوبت رکھتے ہی نہیں۔ پھر کیا یہ صورت مضحکہ خیز نہ ہوگی کہ ظنہ (بیٹیا) اور طاہرہ (بہن) بالکل مساویانہ حصہ پائیں، حالانکہ طاہرہ اگر یسین کی بیٹی بھی ہوتی تو  $\frac{1}{8}$  سے زیادہ نہ پاتی۔ خود زینجا اگر زندہ ہوتی تو اسے  $\frac{1}{8}$  ملتا، مگر کمال ہے اجتہاد کا کہ اب طاہرہ رشتہ بعید رکھنے کے باوجود  $\frac{1}{8}$  پار ہی ہے۔ گویا اب وہ یسین کی بہن نہیں، اس کا ایک بیٹیا بن گئی ہے۔ اسی طرح نعمان زینجا کی قائم مقامی کی وجہ سے بالکل ظنہ کی بہن کا درجہ پا گیا۔ اور اگر نعمان بھی موجود نہ ہوتا تو یہی زینبہ بلندہ یوسف کو ملتا، اور یوسف بھی مر گیا ہوتا تو یحییٰ اس کی جگہ لیتا۔ اسی طرح طاہرہ اگر زندہ نہ ہوتی تو اس کا مرتبہ مریم پاتی۔ خاندان عطا کے زندہ بیٹے کے ہوتے ہوئے  $\frac{1}{8}$  جائداد کا بالکل الگ دو خاندانوں میں جا پہنچنا، یہ شرعی قانون کا کرشمہ ہوگا یا بچوں کا کھیل!

مثال سے - یتیم پوتے کو ایک تو دادا سے میراث دلوائی گئی، لیکن دادا مرحوم سے جو ترکہ اس کی دادی نے پایا ہو، دادی کی وفات پر پھر اس میں سے یتیم کو اپنے باپ کی قائم مقامی کے فارموسے کے تحت ایک حصہ اور دلوانا ہوگا اور اگر اس کے کسی چچا کی اولاد ختم ہوگئی تو اس کے مرنے پر جہاں اُس کا زندہ بھائی ترکہ پائے گا وہاں اس یتیم کو بھی چچا کے مرحوم بھائی کا حق بطور قائم مقام کے دینا چاہیے۔ پھر اس کی ماں بھی مرگئی ہو تو بعد میں جب کبھی اُس کا نانا، یا نانی فوت ہو تو ماں کی قائم مقامی کی وجہ سے اسے پھر حصہ دینا ہوگا۔ پھر اگر اس کی خالہ یا چھوٹی (کلالہ ہونے کی صورت میں) فوت ہو تو اس کی طرف سے بھی اس کے ماں اور باپ کا حصہ زندہ ہو کر محسوب ہوگا! اسی طرح ترکہ کی تقسیم جب بھی عمل میں آئے گی تو مردہ اغترہ بار بار اوپر سے نیچے کو بھی اور نیچے سے اوپر کو بھی، اور دونوں پہلوؤں میں بھی شمار ہونگے اور ان کے حصے بار بار محسوب کر کے ان کے قائم مقاموں میں بانٹنے ہونگے۔ انشاء اللہ ریاضی کی ہر پیچیدہ سے پیچیدہ کسر استعمال میں آئے گی اور یہاں تک کہ تقسیم اشیاء کا معاملہ اجزائے لایتجزئی تک جا پہنچے گا۔ اور چیزوں کے اٹیم گن گن کر بانٹے جائیں گے، (آخر یہ دور بھی تو اٹیم کے کوشموں کا دور ہے!) پھر تو تمام دنیا میں اس اجتہاد کے ڈنکے بج جائیں گے، اسلامی قانون کی بڑی قدر و قیمت ہوگی، اور ملاؤں کی "حماقتوں" کی اصلاح کرنے والے "مسٹروں" کے دماغوں کو سونے میں تو لانا جائے گا۔

ایک اہم حدیث | لیکن ابھی ایک اور استدلال بھی ہے، بظاہر بڑا وزنی! بخاری کی ایک مضبوط روایت ہے کہ مشہور صحابی حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے سامنے کوفہ کی گورنری کے زمانے میں یہ دریافت طلب مسئلہ رکھا گیا کہ ایک شخص مر گیا ہے جس کی ایک



ڑکی، ایک پوتی اور ایک بہن موجود ہیں۔ ان میں سے کس کو کتنا حصہ ترکہ میں ملے گا۔ آپ نے جواب دیا کہ ڑکی کو  $\frac{1}{4}$ ، بہن کو  $\frac{1}{4}$  دینا جائے، پوتی محروم ہے۔ لیکن سائل کو مشورہ دیا کہ وہ



قانون میراث کے ماہر خصوصی (SPECIALIST) حضرت ابن مسعود سے بھی جا کر دریافت کرے۔ وہ حضرت ابن مسعود کی خدمت میں پہنچا۔ آپ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کے فتوے کی تائید کرنے سے معذرت کی۔ پھر فرمایا کہ خود نبی صلعم نے اس مسئلہ کو یوں حل فرمایا کہ لڑکی (سلیمہ) کو ترکہ کا  $\frac{1}{4}$ ، پوتی (جمیلہ) کو  $\frac{1}{4}$  اور باقی  $\frac{1}{2}$  بہن (رابعہ) کو دیا جائے۔ سائل پٹ کر پھر حضرت ابو موسیٰ اشعری کے سامنے حاضر ہوا اور حضرت ابن مسعود کا فتویٰ ان کے سامنے رکھا۔ اس پر انہوں نے اپنا فتویٰ واپس لیتے ہوئے کہا کہ اس خاضل فن کے موجود ہوتے ہوئے مجھ سے دریافت کرنے کی ضرورت نہیں۔

واضح رہے کہ اس حدیث کی صحت پر کامل اتفاق ہے۔

کہا جا سکتا ہے اور ضرور کہا جانا چاہیے کہ جب بیٹی کی موجودگی میں پوتی کو میراث مل سکتی ہے تو ٹھیک اسی کے مطابق بیٹے کے ہوتے ہوئے پوتے کو بھی ملنی چاہیے۔

ہم مان لیں گے، لیکن پہلے تحقیق یہ کرنا ہے کہ یہ تقسیم کس فارمولے کے تحت ہے۔ اگر فارمولا وہی ہے جسے آپ بیٹے اور پوتے کے معاملے میں نافذ کرنا چاہتے ہیں تو پھر کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا۔ آئیے اب حدیث مذکورہ کی مثال پر آپ کا فارمولا چسپاں کر کے دیکھیں۔

سلیمہ کے ساتھ ہم نے انعام کا حصہ زندہ فرض کیا تو تقسیم یوں ہوئی :-

$$\text{سلیمہ (لڑکی)} = \frac{1}{4}$$

$$\text{انعام مرحوم لڑکا} = \frac{1}{4} \quad (\text{یہ حصہ زندہ رکھا گیا})$$

اب ہم انعام کا قائم مقام ٹوہو ٹونڈے نکلے تو ہمیں جمیلہ ملی۔ لہذا جمیلہ کو  $\frac{1}{4}$  ملے گا۔ لیکن کیا یہ تعجب کا مقام نہیں کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری تو پوتی کو سرے سے محروم رکھ رہے تھے، اور پھر جس حدیث کے منصوص حکم نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کے فتوے کو منسوخ کر دیا وہ بھی پوتی کو  $\frac{1}{4}$  دیتی ہے، اور آپ کا جدید اجتہادی فارمولا اپنی جہل نہ اس شکل سے ملتا ہے، نہ اس شکل سے!

پھر کیا آپ حدیث صریح اور متفق علیہ کے مقابلے میں اپنے اجتہاد کا جھنڈا لگا کر کے کھڑے ہو جائیں گے اور جو قانون سازی آپ فرمائیں گے وہ اسلامی فقہ و قانون کی تعریف میں آئے گی۔ سوچئے، فارمولا وضع

کرتے ہیں، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس حدیث کے سمجھنے میں کہیں آپ سے غلطی تو نہیں ہو رہی؟ (ایک منکر حدیث یہاں اگر حدیث کو محبت ماننے سے انکار کرنے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں رکھتا۔ وہ کہے گا کہ یہ روایات گروں کا نتیجہ کاوش ہے، اسی لیے تو بات نہ ادرہ بنتی ہے، نہ ادرہ! لیکن یہاں ہم حجیت حدیث کی بحث چھیڑنے سے معذوری کا اظہار کرتے ہیں)۔

بنیادی غلطی لڑکی اور لڑکے کے معاملے کو ایک قرار دینے میں ہو رہی ہے۔ مثلاً جس طرح حدیث کی نظیر سے آپ نے استدلال کیا، کیا ویسا ہی استدلال یہ بھی نہیں کہ جب لڑکی اور پوتی کے ہوتے ہوئے بہن کو حصہ ملتا ہے تو لڑکے اور پوتے کے موجود ہوتے ہوئے بھی بہن (نیز جانی) کو حصہ ملنا چاہیے لیکن جب تک قرآن اور حدیث اپنی اصلی شکل میں سامنے رہیں گے ایسا نہیں ہو سکتا۔ استدلال مرے سے غلط ہے۔

درحقیقت بیبا عصبہ کی حجیت رکھتا ہے اور ذوی الفروض سے بچا ہوا اریا ذوی الفروض نہ ہوں تو کل مال لے جاتا ہے۔ پھر کوئی بیبا نہ ہو تو پوتا اسی مرتبہ عصوبت پر آجاتا ہے لیکن بیبا عصبہ نہیں ہے نہ پوتی اس کے نہ ہونے کی صورت میں پوتے کا درجہ عصوبت حاصل کرتی ہے۔ بیبا عصبہ ہوتی تو پوتی کا کوئی استحقاق نہ تھا، لیکن اسے صاحبہ فرض ہونے کی حجیت سے اکیلی ہونے کی صورت میں  $\frac{1}{4}$  مال ملے کہ جب ہم مانقی کو ٹھکانے لگانے چلے تو وہ چونکہ عصوبت نہ رکھنے کی وجہ سے پوتی کے لیے پناہ فرود حصہ لینے کے بعد بیٹے کی طرح کلیثہ عاجب نہیں ہے۔ اس لیے پوتی کے لیے گنجائش نکل آتی ہے۔ چنانچہ اسے بروٹے حدیث  $\frac{1}{4}$  دیا گیا اور اس طرح ترکہ کا جملہ  $\frac{1}{2}$  ٹھکانے لگ گیا جو دو بیٹیوں کے حصے کے مساوی

لے پتی کو یہاں بہ منزلہ بیٹی کے لیا تو گیا ہے، مگر بالکل مساویانہ حجیت میں نہیں، کیونکہ بلا واسطہ بیٹی ایک ہے اور اس کا حصہ متعین ہے جو فرضیت رکھتا ہے۔ اس کا لحاظ ضروری تھا۔ مسئلہ کے حل میں خوبی یہ ہے کہ اس میں یہ یکدم دو قاعدوں کو نافذ کر کے انہیں پورا کیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ ایک بیٹی کو  $\frac{1}{4}$  ملے۔ دوسرے یہ کہ دو بیٹیوں کا  $\frac{1}{2}$  ہوتا ہے۔ چنانچہ بیٹی کو ایک ہونے کی وجہ سے  $\frac{1}{4}$  مل گیا اور پوتی کو  $\frac{1}{4}$  دینے سے بیٹی اور پوتی  $\frac{1}{2}$  میں جمع ہو گئیں۔ یہاں ہم فریقہ تفصیل نہیں دے سکتے۔



ہے۔ بالقی کے لیے آنحضرت صلعم کی طرف سے اخص قطعی موجود ہے کہ اجملہ الاخوات مع البنات عصیۃ نہیں بھائی نہ بہنو بہن کو (واقع رہے کہ صرف بیٹیاں ہونے کی صورت میں) اس حدیث کے تحت عصیۃ قرار دے کر اسے حصہ دے دیا جائیگا یہی صورت تھی جسے حضرت ابن مسعود نے اختیار فرمایا۔ اب خوب سمجھ لیجیے کہ یہ حدیث جسے آپ اپنے استدلال کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے، یہ قطعی طور پر آپ کے نظریے کی تردید کرتی ہے اور اس سے استدلال کرنے کا حق نہیں پہنچتا ہے۔ یہ زندہ چچاؤں کے ہوتے ہوئے یتیم پوتے کے وارث نہیں بن سکتے کے لیے اپنے اندر دلیل نہیں رکھتی ہے۔ کیونکہ یہ کسی مردہ وارث کا حصہ زندہ رکھ کر اس کے قائم مقاموں کو پہنچانے والے نظریہ کی باطل منہ ہے۔ مسئلہ زیر بحث میں بیٹی کی حیثیت فرضیت کے بخلاف زندہ بیٹے چونکہ عصبات ہوتے ہیں اور اقرب ترین، لہذا ازوی الفروض کے بعد) وہ پوتے کا پورا ترکہ لے جائیں گے اور ان کی عدم موجودگی میں ان سے پیچھے کی صفوں کے جو افراد عصوبت کے مقام پر آسکتے ہیں وہ ان کی زندگی میں کچھ نہ پائیں گے۔ چنانچہ اگر کسی شخص کے ۱۲ بیٹوں میں سے الیتیم اولاد چھوڑ کر مر گئے ہوں اور صرف ایک ہی زندہ باقی ہو تو اس کا کل ترکہ عصوبت کے مرتبہ اول کی وجہ سے ایک ہی بیٹے کو مل جائے گا۔ ابن الابن کے ابن بننے کا نام مولانا فقہانے وہاں استعمال کیا ہے جہاں مرتبہ عصوبت پر کوئی ابن موجود نہ ہو۔ اس صورت میں تمام کے تمام پوتے عصوبت کے مساویانہ مرتبے پر آجائیں گے، اور وہ نہ ہوں تو پوتے وغیرہ!

صورت پنجم — یہ ہے کہ آنکھیں بند کر کے اسلامی فقہ و قانون کے خفی مسائل کو سمجھو اور بھیغیر اور کلیات اور فارمولوں کا لحاظ کیے بغیر ایک حل قانون سازی کے اختیارات کے بل پر شریعت پر ٹھونس دیں۔ اس جاہلانہ صورت کا مقابلہ استدلال سے کرنا بیچارہ ہے۔ اس کا جواب صرف رائے عام کی قوت سے دیا جاسکتا ہے۔ یہ تو حکم کھلا شارع کا مقام حاصل کرنے کی اور شریعت کے قانون کو مردم برجم کرنے کی صورت ہے!

مسئلہ کا حل کیا ہے؟

مسئلہ کا حل قرآن اولیٰ میں الیتیم پوتے کی عمری گذشتہ ۳ صدیوں میں بہر حال بارہا ایک واقعہ کی حیثیت

میں امت کے سامنے آئی ہوگی، لیکن کیا وجہ ہے کہ نہ اس مسئلے پر کوئی اضطراب پایا گیا ہے اور نہ کوئی مفصل اختلافی بحث ملتی ہے؟ اس کے دو وجوہ ہیں :-

(۱) مسلمانوں کی پوری امت میں ایک طرف شریعت کے بارے میں پورا پورا جذبہ احترام کا فرما رہا ہے یعنی جس مسئلے میں انہوں نے دیکھا کہ شریعت یوں کہتی ہے تو پھر اس کے اندر بظاہر کسی ناخوشگوار پہلو کے موجود ہوتے ہوئے بھی انہوں نے مہر تسلیم خم کر دیا ہے۔ دوسری طرف ان میں سنت نبوی کے شرعی حجت و سند ہونے پر ایمان کا فرما تھا اور کوئی گروہ ان کے اندر ایسا پسپائی کا جو سنت پر حملہ آور ہونے کے لیے قانون شرعی میں کیڑے ڈالنے کی جسارت کر سکتا، کہ جس سے متاثر ہو کر وہ ذہنی انتشار میں پڑ جاتے۔ تیسری طرف قانونیات کے دائرے میں وہ صحابہ تابعین، تبع تابعین اور ائمہ فقہاء اور اپنے وقت کے علمائے قانون کے علم و تحقیق پر اعتماد رکھتے تھے اور یہ طرز فکر ان میں کبھی نہیں پایا گیا کہ وہ سرمایہ فقہ و قانون کو چند ملاؤں کے تیرنگوں کا حاصل یا ایک عجی سازش کا نتیجہ قرار دیں۔

تیسرا پتہ اگر محروم رہ جاتا تھا تو مسلمانوں نے اس کے مسئلے کو سوسائٹی میں دوسرے بہت سے دور نہ پانے والے نیامی و ایامی کے مسئلے کی سطح پر ہی رکھ کر حل کیا ہے۔ وہ اس طرح کی شاذ قابل غم صورتوں کو دیکھ کر سنت نبوی یا سرمایہ فقہ و قانون کے بارے میں شبہ میں نہیں پڑے۔

گویا اپنے دین کا پورا شعور، سنت پر ایمان، آجماع کا احترام اور قانونیات میں ماہرین فن کے علم و تحقیق پر اعتماد رکھنے کے لحاظ سے جب تک سوسائٹی تربیت یافتہ رہی، تو یہ مسئلہ اس طرح فقہ کی صورت اختیار کر کے کبھی سامنے نہیں آیا۔ اور اب تربیت کا یہی خلا ہے جو مذہبی فقہ گروں کو سنت اور فقہ و قانون کے خلاف معرکہ آرائی تک کا موقع دے رہا ہے۔

(۲) اسلام کے معیاری دور میں، بلکہ بگاڑ شروع ہونے کے بعد تک بھی مسلم معاشرے میں یتیم پوتے کے مسئلے کے مناسب حل عملاً کارفرما رہے ہیں۔ یہ حل حسب ذیل تھے :-

لے اس جذبہ کو منکرین حدیث نے "افیمون زدگی" سے تشبیہ دی ہے

ایک یہ کہ اپنی طہ جائداد میں وصیت کا جو حق ہر شخص کو شریعت نے دیا ہے اور جسے بعض علماء و جہاں بھی ماننے والے ہیں اس کا مدعا جہاں یہ تھا کہ مرنے سے پہلے آدمی سوسائٹی کی اجتماعی ضروریات کے لیے کچھ وقف چھوڑ جائے، اور یہ تھا کہ وہ ایسے اقربا کے خاص احسانات یا خدمات کا صلہ دے سکے جو اس کے وراثت نہیں ہیں، وہاں بدرجہ اولیٰ یہ بھی تھا کہ قانون کے رد سے جو اقربا محروم رہ جاتے ہیں لیکن وہ سہارے اور مدد کے محتاج ہوں ان کے لیے مہر و سامان کیا جاسکے۔ اور وہ صالح جذبات کا اظہار کرتے جو ان مقاصد کے لیے وصیت کرنے کے محرک ہو سکیں۔

دوسرے یہ کہ کوئی شخص جب اپنے ترکے سے بعض قریبی عزیزوں، خصوصاً یتیموں اور یرواؤں کی محرومی کا اندیشہ محسوس کرتا تھا تو وہ زندگی میں مہرہ کر کے اس اندیشے کا سدباب کر لیتا تھا۔ تیسرے یہ کہ جب کسی ثناء صورت میں بے سہارا یتیم پونے پوتیاں و دانا کی میراث سے محروم رہ جاتے تھے تو ان کی کفالت دوسرے پرستی کی ذمہ داری ان کے چچاؤں پر عاید ہوتی تھی۔ اس سلسلے میں یہ واضح کر دینا مناسب ہو گا کہ حضرت عمرؓ نے چچاؤں کو یہ ذمہ داری اٹھانے پر اپنے دور خلافت میں مجبور کیا ہے۔ افسوس ہے کہ اس وقت حوالہ مستحضر نہیں۔ یہ اس لیے بھی مناسب ہے کہ ہر تہیم لپتے کا دادا یا ہر تہیم بچے کا والد ضروری نہیں کہ میراث چھوڑ کر مرے! اکثر حالات میں یتیموں کی کفالت قریبی مہر پرستوں پر لازم آئے گی۔

چوتھے یہ کہ یتیموں، یرواؤں اور عام بے سہارا لوگوں کے لیے ایک مستقل حل اسلامی میت المال کا وجود تھا یعنی ہر بیکس بچے، بوڑھے یا عورت کی کفیل اور مہر پرست اسلامی سوسائٹی اور اسلامی حکومت ہوتی تھی۔ اور وہ اپنے اجتماعی خزانے کے ذریعے اسے سنبھالتی تھی۔

اب آپ نہ تو مسلمانوں کی صحیح ذہنی تربیت ہی کا کوئی سامان کرتے ہیں، نہ سوسائٹی میں محروم رہنے والے اقربا کے لیے وصیت اور مہر کی ترغیب عام کرتے ہیں، نہ آپ یتیم پوتوں کے لیے چچاؤں کی کفالت ہم پہنچانے کی کوئی صورت پیدا کرتے ہیں، اور پھر نہ عروہین و مغربیوں کے لیے اجتماعی سہارا ہی ہم پہنچاتے ہیں۔ ان سارے خلاؤں کو جو ان کا توں برقرار رکھ کر آپ پورا اور ایک ایسی صورت

سے مسئلہ حل کرنے پر صرف فرمایا ہے میں جس کے لیے اسلامی قانون میں کھپت کی گنجائش بغیر اس کے ڈھانچے کو توڑے پیدا نہیں کی جاسکتی۔ اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک خاص کیل یا پیچ کو کسی مشین میں نصب کرنے کے لیے پونڈی مشین کو چور چور کر کے مشین ہی ایک نئی بنا ڈالی جائے۔

قانون سازی کے ذریعے مسئلے | ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ سوسائٹی کے موجودہ حالات کو مختلف پہلوؤں سے کے حل کی مناسب صورتیں بدلنے میں وقت لگے گا، اور پیش نظر مسئلے میں ہمیں فوری قانونی حل مطلوب ہے۔ یہ قانونی حل چند ایسے طریقوں سے کیا جاسکتا ہے جو شرعی قانون کی مجموعی ساخت کو تباہ نہیں کرتے۔ بحالات موجودہ ذیل کی صورتیں اختیار کی جاسکتی ہیں:-

۱)۔ یتیم پوتے کو دادا سے میراث دلوانے کے لیے ایک قانونی دروازہ قاعدہ وصیت کے تحت کھولا جاسکتا ہے۔ اس کی نظیر مصر میں قائم ہو چکی ہے۔ حکومت مصر نے اس مسئلے میں انکارِ حدیث اور تخریبِ فقہ کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے علماء سے استصواب کیا اور علماء نے بالاتفاق ایک صورت تجویز کر دی۔ اس صورت کی بنیاد وصیت کے وجوب کے نظریے پر رکھی گئی جو پہلے سے جاری ایک نہ ایک فقہی مکتب خیال کے مختارات میں شامل رہا ہے۔ مصری قانون یتیم پوتوں وغیرہ کے ہونے کی صورت میں دادا کے لیے وصیت کو لازم سمجھ کر اس کی موت پر اس کے ترکہ کی ۱/۲ کی حد تک رقم از کم اتنی مقدار جتنی یتیم پوتوں کے والد کو ملتی ہے کے لیے وصیت کو موجود قرار دیا ہے۔ اگرچہ دادا یہ وصیت نہ کر سکا ہو۔ نیز اگر اس نے کسی وصیت کے ذریعے اپنے یتیم پوتوں پوتیوں اور نواسوں کو اسیوں وغیرہ کے علاوہ کسی اور رشتہ دار کو ترکہ کا حق دیا ہو تو یہ وصیت ۱/۲ ترکہ کے اس مانقی کی حد تک پوری کی جاتی ہے جو یتیم پوتوں پوتیوں اور نواسوں کو اسیوں وغیرہ کو نہ کوہہ بالا مقدم تر قانونی وصیت کے مطابق ان کا حق ادا کرنے کے بعد بچ رہے۔ (ملاحظہ ہو: "الموارث الاسلامیہ" مولفہ احمد کامل دفعہ ۷۶ صفحہ ۲۸-۳۷-۱۳۷- مطبوعہ سنہ ۱۹۵۵ء)

یہ معاملہ ہزار قابلِ بحث و اختلاف ہو، مگر اسلامی نظامِ فقہ میں چونکہ اس کی نظر ماتی بنیاد موجود ہے، نیز اس سے کوئی قانونی کلیہ نہیں ٹوٹتا، اور یتیم پوتوں پوتیوں اور نواسوں کو اسیوں کا وہی حصہ بھی

مل جاتا ہے جو کسی دوسری طرح دیا جائے تو کسی نہ کسی طرف سے شرعی قانون کے ڈھانچے کو بہر حال ضرر پہنچتا ہے۔

(۲) — لوگوں کے لیے اپنے ایسے عزیزوں کے حق میں جو ان کے ترکہ سے حصہ نہ پانے والے ہوں، زندگی میں مہربان کرنے کا جو دروازہ شریعت اسلامیہ نے کھول رکھا تھا اُس پر بھاری ٹیکسوں اور دوسری پابندیوں کے جو پیرے بٹھا دیئے گئے ہیں، اُن کو ہٹا دینے کے لیے ترمیمی قانون سازی کی ضرورت ہے۔ وصیت سے بھی زیادہ بہتر شکل یہ ہے کہ دادا یا نانا اپنے یتیم پوتوں یا نواسوں کے لیے اپنی زندگی میں معقول بندوبست کر کے رخصت ہو۔

(۳) — بروئے قانون ہر یتیم پوتے یا نواسے — خصوصاً جو محروم الارث بھی ہو، یا جس کا دادا یا نانا کوئی جائداد رکھتا ہی نہ ہو — کی کفالت دوسرے پرستی کا بار چھوڑ دیا جائے یا ماموں پر ڈالا جانا چاہیے۔ اسی طرح دوسرے تمام تیامی و ایامی کے باسے میں اُن کے اقربا کی ذمہ داریاں کسی نہ کسی حد تک قانونی طور پر کی جاسکتی ہیں۔ ایسا قانونی اقدام حضرت عمرؓ کی قائم کردہ نظیر پر مبنی ہوگا۔

(۴) — مذکورہ بالا تین باتوں میں سے ایک یا چند کے اختیار کرنے کے ساتھ بالکل متوازی طور پر جو چوتھی صورت اصلاح پیدا کی جانی چاہیے وہ یہ ہے کہ ملک کے تمام تیامی، ایامی اور معذوروں کے لیے حکومت کی طرف سے قانونی کفالت کی ضمانت ہم پہنچائی جائے۔ اس کام کے لیے حاجت مندوں اور معذوروں کی لسٹیں بنا کر بجٹ میں باقاعدہ مذکورگی جائے۔ اور اگر میر دست اس ذمہ داری کو حکومت پر ہی وسعت کے ساتھ نہ سہارا سکے تو (اقبال چیمہ صاحب جیسے محترمہ ہائے رحم و شفقت) ذرا تہمت سے کام لیں تو کم سے کم محروم الارث رہ جانے والے یتیم پوتوں اور نواسوں اور بختیجوں وغیرہ کے لیے رجسٹرڈ بھریں بہت تھوڑی تعداد رکھتے ہونگے) سرکاری خزانے سے وظیفہ کفالت (مع تعلیم و معالجہ کی سہولتوں کے) کا انتظام کر دیا جائے۔ اس معاملے میں صریح امدادیت اور قطعی طور پر ثابت شدہ سنت نبویؐ وال ہے۔ آپ نے فرض چھوڑ کر مرنے والے، اور یتیم اور بیواؤں کو چھوڑ کر رخصت ہونے والے مسلمانوں کے باسے میں ساری ذمہ داری بحیثیت اسلامی ریاست کے کام پر دیا

(HEAD) کے اپنے سر لی تھی۔ یہ ذمہ داری اب ہر اس مسلم حکومت پر عاید ہوتی ہے جو نبی صلعم کے دیشے ہوئے نظام کو چلائے۔

جس شریعت کے قانون کے زیر اثر کچھ تنہم محروم رہتے تھے اُس نے اُن تنہموں کے لیے انتظامات بھی کیے تھے۔ لیکن اُن انتظامات کو عمل میں لانے کی ذمہ داری تو ہماری حکومت کے کاہر وراز سر لیں نہیں، اور پھر محرومی کے مسئلے پر ملاؤں کو کوہیں اور شریعت کے قانونی نظام کو درجہ برہم کرنے پر آترائیں تو یہ دھاندلی معقولیت سے بہر حال کو سوں دور ہے۔

ہم مذکورہ بالا تدابیر کو پیش کر کے پوچھتے ہیں کہ کیا ان سے مسئلہ معقول طریق سے حل ہوتا ہے یا نہیں؟ پس اگر مدعا اس خاص مسئلے کا حل کرنا ہو، تو راستہ صاف ہے، لیکن اس مسئلے کی آڑ میں اگر نیت کچھ اور ہو تو اس ”کچھ اور“ کو الگ زیر بحث لایا جاسکتا ہے۔

### اقبال حمیہ صاحب سے خصوصی گزارش

اوپر کے صفحات میں جو دلائل شرعی قانون وراثت کے بارے میں پیش کیے گئے ہیں، اگر آپ کو اس قانون کی بنیادوں اور آغذ میں کوئی اختلاف نہ ہو تو رعیت مسئلہ کو سمجھنے میں ضروری حد تک یہ مدد سے سکیں گے۔ ان کے مطالعہ سے آپ کو یہ بھی اندازہ ہو جائے گا کہ یہ قانون ایسا لامحدود میدان تک و نماز فراہم نہیں کرتا کہ پروگنڈے اور ووٹوں کی تعداد سے جو شے بھی کسی اسمبلی میں پاس کر ڈالی جائے وہ آپ سے آپ ”قانون شرعی“ قرار پائے۔ خدا اور اس کے رسول کے صریح احکام اور ان احکام کے واضح اشارات و دلالت (جن پر اجماع بھی ہے) کے مقابلے میں ان اسمبلیوں کا یہ اختیار سرے سے قابل تسلیم نہیں ہے کہ وہ مجرد اکثریت کے بل پر جو چاہیں فیصلہ کر ڈالیں۔ ان کو بہر حال کتاب و سنت اور اجماع کے حدود میں رہ کر کام کرنا ہوگا۔ لیکن ان حدود کو اگر یہ توڑنے پر متل جائیں اور شرعی مسائل میں اپنے آزادانہ فیصلے نافذ کریں تو اس سے بہتر یہ ہے کہ قانون شریعت کو کھلم کھلا چھوڑ کر جس دوسری شریعت پر دل ٹھکے، اسے اختیار کریں، یا جو نئی شریعت چاہیں بنائیں۔

ایسے آزادانہ فیصلوں سے قانون شریعت وجود نہیں پاتا۔

آپ کے ترمیمی مسودہ قانون میں دو بنیادی غلطیاں ہیں:-

ایک یہ کہ شریعت اسلامیہ کے قانون میراث میں جدی اور خود پیدا کردہ جائداد و املاک کی تیز کا کوئی نشان نہیں ملتا، حالانکہ آپ دونوں میں فرق کر رہے ہیں۔ قرآن، حدیث، اجماع، تہمیں اس کے خلاف ہیں۔

دوسرے یہ کہ آپ کے الفاظ "... گویا کہ متذکرہ اشخاص آخری مالک کی وفات کے فوراً ہی بعد فوت ہوئے" میں جس مفروضہ کو واقعہ بنا کر قانون پر اثر انداز کیا گیا ہے، یعنی آخری مالک کی وفات سے قبل فوت ہونے والوں کا حق اس کے ترکہ میں قائم کیا گیا ہے، اس مفروضہ کو قرآن، حدیث یا اجماع تو کجا، کسی تیسرے درجے کی عدالتی نظیر یا کسی مفتی کے شخصی فتویٰ تک میں آج تک اس ڈھنگ سے استعمال نہیں کیا گیا۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ کسی مورث کی زندگی میں کسی ممکن وارث کا حق وراثت اس کے املاک پر عائد نہیں ہوتا، اور نہ کسی متوفی کے ترکہ میں اس سے قبل مرجانے والے کسی ممکن وارث کا حصہ زندہ شمار کیا جاتا ہے۔ اس فارمولے کو آپ نے ہندو و واجی قانون سے لیا ہو، یا فرانسیسی قانون وراثت سے اخذ کیا ہو، ہمارے نظام قانون کے لیے بہر حال بالکل اجنبی چیز ہے، جیسا کہ اوپر ہم واضح کر چکے ہیں۔

یہ غلطیاں اگر آپ محض اپنے دیہی علاقے کے وٹروں یا صوبے کے عوام، کو خوش کرنے کے لیے کر رہے ہیں تو قطع نظر اس سے کہ خدا و رسول کی رضا کو قربان کر کے وٹروں کو خوش کرنا شرک کی ایک بدترین صورت ہے، ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ آپ کی ترمیم کے دور رس اثرات ترمیم پوتے کے علاوہ جب نو اسیوں اور بھتیجیوں بھتیجیوں اور بھانجیوں بھانجیوں، دامادوں اور بہوؤں کو بیٹوں کی موجودگی میں وارث بنائیں گے تو اس وقت آپ کے وٹو سر پیٹ لیں گے۔ بعید نہیں کہ یہ قدم آگے چل کر آپ کو واپس لینا پڑے۔

آخر میں ہم یہ بھی کہنا ضروری سمجھتے ہیں کہ چیمبر صاحب ہوں، یا کوئی اور بزرگ، انہیں مسلمانوں کی اکثریت کے نظام فقر و قانون سے ذاتی طور پر کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو، اور وہ منکرین حدیث بلکہ مورث کے



منکرین دین کے نظریات پر ایمان کیوں نہ لے آئیں، قانون سازی کے اختیارات کو استعمال کرتے وقت ان کو یہ سوچنا چاہیے کہ یہ اختیارات ان کے پاس جس قوم کی طرف سے ایک مقدس امانت بنا کر سونپے گئے ہیں اُس کا مستحکم نظام فقہ و قانون آپ کے پسندیدہ نظریے اور آپ کی مجوزہ ترمیم کے حق میں نہیں ہے۔ اب اگر اسمبلی میں شریعت پر اعتماد نہ رکھنے والے یا اس کو نہ جاننے والے لوگ محض اپنی اتفاقی اکثریت کے زور سے قوم پر منکرین حدیث کے نظریہ و مسلک کو منڈھ دیں تو یہ ظلم ہوگا، اور اس کے خلاف لازماً احتجاج کیا جائے گا۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ جس نئے فقہ و شریعت کو آپ پسند کرتے ہوں، پہلے اُس پر رائے عام تیار کریں اور اسی کے نام پر منتخب ہوں، پھر آپ کو حق ہوگا کہ من مانی شریعت وضع کریں۔

بہتر یہ ہو کہ قانون شریعت کو آپ حضرات سیاسی مقاصد کی بساط کا داؤں نہ بنائیں۔ معقول طریقہ یہ ہے کہ اسلامی قانون کے ماہرین (جو مختلف مدرسہ ہائے فکر سے تعلق رکھتے ہوں) کی ایک مجلس منظم کر کے آپ اس قسم کے مسائل کو اس مجلس کے سامنے فکر و تحقیق کے لیے پیش کرنے کا راستہ نکالیں، تاکہ بات بات پر بے جا ذہنی کشمکش اور نظریاتی تصادم پیدا نہ ہو۔